مسلم تنصیبات

ان کی بنیادیں اور ان کی نشو و نما

از

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی

ڈین فیکلٹی آف آرٹس یونیورسٹی آف کراچی

مترجمہ: سید حسن ریاض

پہلا ایڈیشن

نشریات جمعیت الفلاح کراچی

ناشر:- ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سکریٹری جمعیت الفلاح کراچی

فہرست ابواب ومضامین

صفحہ

انتساب

ڈاکٹر اشتیاق صاحب قریشی
وائس چانسلر
یونیورسٹی آف کراچی

کے نام میں یہ کتا

کا مظہر رہے ...ن کرتا ہوں تاکہ یہ اس محبت اور احترام

اپنے دل ...ہر وقت ترقی کے ساتھ اس ذات گرامی کے لئے

کی خد...ں کرتا ہوں۔ انھوں نے جس طرح اسلام اور پاکستان

ا... لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے وہ ہم میں سے اکثر کے لئے

...ن مثال ہے۔ اور ترغیب خدمت۔

امیر حسن صدیقی

دیباچہ

اسلام ہمہ گیر مذہب ہے اور ایک کامل نظام اجتماعی۔
طرزِ عمل، قومی تمدن اور بین الاقوامی تعلقات، انسانی زندگی کے ان
ضابطہ اور رابطہ قائم کرتا ہے۔ آدمی کا اللہ سے تعلق، معاشرے میں اس کا
تخلیق اور تمام کائنات میں اس کو کس مقصد کے لئے عمل کرنا ہے، اسلامی ع
مسائل پر حاوی ہیں اور ان سے مسلمانوں کی فکر و نظر کا ایک نرالا رخ معین ہو
اور دوسرے مذاہب کے درمیان یہ بین فرق ہے کہ اسلام ایک کامل طریقہ زن
دوسری نہیں اور بجائے اس دنیا کے ترک اور اس کو ناچیز سمجھنے کی تعلیم کے وہ ا
چاہتا ہے اور اخلاقی طرزِ عمل سے اس کی تزئین۔ انہی اوصاف کی وجہ سے اسا
میں وہ طاقت ثابت ہوا جس سے تہذیب و ثقافت کی تخلیق ہوئی۔

تاریخ کے طالب علم اور استاد کی حیثیت سے میں تمام عمر اس بہ متا
رہا کہ دنیا کی تاریخ میں جتنے انقلابات کا ذکر ہے ان سب سے اختلال واقع ہوا، ما

انفرادی اخلاق، معاشرتی
تمام پہلوؤں میں یہ
کا مقام، منصوبہ
قائدان سب
جاتا ہے۔ اسلا
رگی ہے جو
کی اصلاح
م تاریخ
قعہ پر متحیر
ر اسلام

انسانی زندگی میں کامل انقلاب کیا اور اس سے معاشرتی زندگی ہموار ہوگئی۔ اخلاقی اور مادی، دینوی اور روحانی، معاشی اور معاشرتی، سیاسی اور عدالتی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ان تمام شعبوں میں اپنے مظاہر کی نمائش کر کے اسلامی تعلیمات نے کامل تبدیلی واقع کی، اور ایسی تنظیمات کی تخلیق، جن سے مسلمانوں کی زندگی اور فکر میں توازن قائم ہوگیا۔ یہ تنظیمات اسلامی انقلاب کے لنگر ہیں۔ انہوں نے مسلم زندگی کی مثالی صورت معین کی اور اسلامی تعلیمات کو ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔ نہیں انہوں نے معاشرے کا رکھ رکھاؤ اور مزاج قائم کیا، اور ایک نسل کی ثقافت نسل در نسل منتقل کی۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ ماضی قریب کے مورخوں نے معاشرتی تنظیمات کے مطالعے کو وہ اہمیت نہیں دی جس کی وہ مستحق ہیں۔ مجھے یہ یقین راسخ ہے کہ صرف سیاسی طاقتوں کے مد وجزر کے مطالعے سے اسلامی تاریخ کے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا کہ اسلام کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی اور ثقافتی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا جائے۔

اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے عباسیوں کے زوال تک اسلامی تنظیمات کی نشو و نما بیان کی جائے۔ چونکہ اس مضمون پر تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے اس لئے میں نے ان تنظیمات سے اس کا آغاز کیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھیں اور پھر خلفائے راشدین کے عہد کی تنظیمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں عہد مل کر اسلام کا عہد زریں ہیں۔ اگلے ابواب میں ان ترتیبوں کا ذکر ہے جو اموی اور عباسی حکومتوں کے تحت ہوئیں۔ اس لئے یہ مطالعہ مسلمانوں کی معاشرتی تاریخ کے پہلے بڑے حصہ تک محدود ہے۔ امید ہے کہ اسلامی تاریخ کے طالب علم خصوصاً اور تعلیم یافتہ مسلمان عموماً اس کتاب کو مفید پائیں گے۔

اس کتاب کی ترتیب میں میں نے ماوردی کی "الاحکام السلطانیہ" سے زیادہ

استفادہ کیا ہے جو زیر نظر عہد کی معاشرتی تاریخ کے مواد کی کان ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ڈاکٹر ایس اے، کیو ہاشمی کی "عرب ایڈمنسٹریشن" سے وسعت کے ساتھ کام لیا ہے میں ان کا احسان مند ہوں۔

مسٹر خورشید احمد ایڈیٹر "وائس آف اسلام" نے اس کتاب کی تیاری میں مجھے قیمتی مشورے دیئے۔ ڈاکٹر ایم اے، خان لیکچرر اسلامک ہسٹری یونیورسٹی کراچی نے بہت سے مواقع پر میری مدد کی۔ مسٹر وحید الدین لیکچرر پولیٹیکل سائنس اور ایم ڈبلیو گرڈر انسٹرکٹر ہیومینٹیز نے پروف پڑھے اور ڈاکٹر ایم ایس، جیلانی۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف سوشیالوجی نے اس کا انڈیکس مرتب کیا۔ ان سب حضرات کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

امیر حسن صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ۱

اسلام
اس کے معنی اور وہ جو اس سے عبارت ہے،

اسلامی انسٹی ٹیوشنوں[ؔ] کے صحیح تصور کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام کے کیا معنے ہیں۔ اس سے کیا عبارت ہے اور اسکے کیا مقاصد ہیں۔ اس لئے اس کتاب کے پہلے باب میں جو اسلامی انسٹی ٹیوشنوں پر ہے اسی مسئلے پر بحث کرنا ضروری ہے۔

مغربی مستشرقین اکثر اسلام کو محمڈنزم (یعنی محمدیت) کہتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں اصطلاحیں ایک معنے میں استعمال کرنا غلط ہے۔ مغربی مستشرقین نے یہ غلطی اس وجہ سے کی ہے کہ وہ مذاہب کے نام ان کے بانیوں کے ناموں پر رکھنے کے عادی ہیں: جیسے بدھ ازم، کرسچینیٹی

ؔ Institution. یہ انگریزی لفظ اس زمانے میں بہت سی مختلف چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کے معنی میں بڑی وسعت ہے۔ معمولی طور پر انسٹی ٹیوٹ کے مصدری معنے ہیں قائم کرنا یا نصب کرنا۔ انسٹی ٹیوشن کے معنی ہیں وہ چیز جو قائم کی گئی ہو یا قائم ہو گئی ہو۔ عربی اور فارسی لغات میں انسٹی ٹیوشن کے معنے یہ ہیں:۔ رسم، معمول، عرف، تعیین، نصب، برقراری، برپا سازی، موسسہ، تاسیس، نظام وغیرہ۔ اردو اخبار نویس انسٹی ٹیوشن کا ترجمہ عموماً ادارہ کرتے ہیں۔ مدرسے، یونیورسٹی، انجمن، دفتر اور محلے وغیرہ کو ادارہ کہیئے تو جہاں ہو

نوواسٹرائنزم وغیرہ۔ لہٰذا انہوں نے اسلام پر گفتگو کرنے میں بھی، جس کی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ فرمائی یہی اصول برتا، اور اس کو محمڈنزم کہنے لگے۔ مگر واقعی اس مذہب کا نام جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے، اسلام ہے، اور ان کا نام جو اس مذہب کی پیروی کرتے ہیں مسلم ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ مذہب کا نام اس کے بانی کے نام پر ہونے کی جگہ خود بانی کو مسلم کہا گیا حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں تمام اللہ کے پیغمبروں کو مسلم کہا گیا ہے اور اس مذہب کو جس کی انہوں نے تبلیغ کی اسلام مگر انمیں اور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف یہ فرق ہے کہ دوسرے پیغمبروں نے مختلف اقوام میں اور مختلف زمانوں میں اس مذہب کی تبلیغ کی، اور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری مبلغ تھے اور ان کا پیغام تمام اقوام عالم کے لئے ہے اور ہر اس زمانے کے لئے جو کبھی آئے۔

اسلام ان عظیم مذاہب میں آخری ہے جو ایسی طاقتور تحریکات تھیں جنہوں نے دنیا میں انقلاب کر دیا اور اقوام کی قسمتیں بدل دیں۔ لیکن اسلام صرف آخری ہی مذہب نہیں بلکہ وہ ہے جس میں تمام سابقہ سچے کتابی مذاہب داخل ہیں، اور اس کی بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے تمام پیروؤں پر یہ واجب کر دیا ہے کہ دنیا کے ان سب مذاہب کو سچا سمجھیں جو وحی کے ذریعے سے آئے تھے اور ان سب پیغمبروں پر ایمان رکھیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ

جاتا ہے۔ لیکن نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ کو ادارہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا ہے مگر انسٹی ٹیوشن کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کا نام ہی مسلم انسٹی ٹیوشنز ہے اور مختلف نوعیت کی چیزوں کیلئے اسمیں لفظ انسٹی ٹیوشن استعمال ہو سکتا ہے اسلئے اس اصطلاح کا ترجمہ ضروری ہو گیا۔ بہت غور کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وسعت کے اعتبار سے انسٹی ٹیوشن کا قریب ترین ترجمہ تنصیب ہے اور یہ ہر اس چیز کے لئے بولا جا سکتا ہے جس کے لئے انسٹی ٹیوشن بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں اگرچہ بعض جگہ ادارہ بھی آگیا ہے، مگر کثرت سے میں نے تنصیب ہی استعمال کیا ہے، یہاں تک کہ کتاب کے نام میں بھی۔ (مترجم)

علیہ وسلم سے قبل مبعوث ہوئے۔

اسلام کا عظیم ترین مقصد یہ ہے کہ دنیا کے تمام کتابی مذاہب کے درمیان برادرانہ تعلقات پیدا کرکے دنیا میں امن قائم کرے۔ وہ تمام مذہبی حقائق یکجا مجتمع کرے جو سابقہ مذاہب میں ہیں، ان کی غلطیوں کی اصلاح کرے اور حق کو باطل سے الگ کرے۔ اس حقیقت ابدی کی تبلیغ کرے جو کسی نسل یا معاشرے کے خاص حالات کی وجہ سے اس کے ارتقا کی ابتدائی منازل میں نہیں کی گئی اور سب کے بعد یہ کہ اس انسانی معاشرے کی اخلاقی اور روحانی ضروریات پوری کرے جو دواماً ترقی پذیر ہے۔

اسلام کے لغوی معنے اطاعت اور فرماں برداری ہیں اور مذہب کی اصطلاح میں اسکے معنے، جس طرح کہ اللہ کے آخری پیغام یعنی قرآن میں درج ہیں، یہ کہ اپنے نفس کو کلیتاً اللہ کی مرضی کے تابع کردیا جائے۔ ان معنے کی رو سے مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ اس قانونِ الہٰی (یعنی قرآن) کو اپنی زندگی میں نافذ کریں۔ اللہ کے ساتھ اپنے ذاتی تعلق امں اور اپنے معاشرتی طرزِ عمل میں، اپنی اقتصادی اور سیاسی سرگرمیوں میں اور لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں۔ مسلمانوں کے اعمال قانون الہٰی کے مطابق رہنے چاہیئں۔ ان کی تمام حرکات وسکنات، ان کی عبادتیں اور ان کی قربانیاں، ان کی زندگی اور ان کی موت سب اللہ کے لئے ہونی چاہیئے جو ان کا خالق ہے۔ اس کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ اس کی مخلوق سوائے اس کے کسی اور کی اطاعت کرے۔

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین

اسلامی قانون اور اسلامی اخلاقیات جس طرح کہ وہ قرآن میں، حدیث میں اور فقہ میں درج ہیں پوری انسانی زندگی پر حاوی ہیں۔ اسلامی تعلیمات صرف عبادت الہٰی اور اللہ کی پرستش کے طریقوں تک محدود نہیں ہیں اور نہ اس تک کہ روحانی مفہوم میں فنافی اللہ کا درجہ کیونکر حاصل کیا جائے بلکہ اس میں بڑی تفصیل سے اس کے لئے ہدایات ہیں کہ اس دنیا کے

مسائل کیونکر حل کیے جائیں جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کے آدمی سے کیا تعلقات ہوں۔ ان میں اس کی معاشرتی اور سیاسی زندگی سے بحث کی گئی ہے اور نکاح و طلاق اور وراثت کے مسائل سے، نیز ان سے جو دولت کی تقسیم، مزدور اور سرمایہ دار کے تعلق عدلیہ، فوجی تنظیم، جنگ و صلح، بالبہات قرضے اور معاہدات سے متعلق ہیں۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کی کس طرح خدمت کی جائے اور ایسے ہی بے شمار مسائل میں انسان کیلئے ہدایت ہے۔ اگر ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھے تو آدمی اطمینان و سکون کے ساتھ پُرمسرت زندگی بسر کرسکتا ہے۔ صرف انفرادی ترقی کے لیے نہیں بلکہ معاشروں قوموں اور بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے اس نے قواعد ضوابط وضع کر دیے ہیں۔

عالمگیر مذہب کی حیثیت سے اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بڑی سادگی ہے۔ وہ بڑا واضح اور صاف ہے۔ انسانی مسائل کے حل میں نہایت درجہ حقیقت کے مطابق ہے۔ نہ وہ حد سے زیادہ امل پسندی کی طرف جھکا ہوا ہے اور نہ حد سے زیادہ مایوسی کی طرف بلکہ اس کی راہ بین بین اور معقول اور متوازن طریقۂ زندگی ہے۔ چونکہ اسلام ایسا ہے اس لئے وہ نہ انہیں گوارا کرتا ہے جو عیش و نشاط اور خفیف حرکتیں اپنا مقصد زندگی سمجھتے ہیں اور نہ انہیں جو دنیا کی تمام راحتیں ترک کرتے ہیں۔ اسلام میں نہ ان لوگوں کے لئے کوئی جگہ ہے جو اخلاقی اختلال کے حامی اور بے راہ روی کے دلدادہ ہیں، اور نہ ان کیلئے جو راہب اور تارک الدنیا ہیں۔ اس میں حقیقی آزادی ہے اور انسان کی فطری اور طبعی خواہشات کی جائز طریقے پر تکمیل کی اجازت۔ اس طرح وہ انسان کے لئے دارین کی راحتیں اور آسائشیں مہیا کر دیتا ہے۔ گناہ اولے[1] کا عقیدہ اس نے مسترد کر دیا ہے اور اس کا قائل ہے کہ سب مرد اور عورتیں معصوم پیدا ہوتے ہیں اور یہ صرف اپنے چلن سے ہوتا ہے کہ وہ اچھے یا برے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اسلام یہ تسلیم کرتا ہے کہ معاشرتی اور خارجی حالات کا کسی شخص کے چال چلن اور

---

[1] Original sin

کردار کی تشکیل پر بڑا اثر ہوتا ہے اس لیے اپنی تعلیمات کے مطابق وہ انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کمیونزم اور دوسرے فلسفوں کی طرح وہ یہ نہیں مانتا کہ اقتصادی اور اجتماعی حالات کے بہتر ہونے سے اشخاص از خود خوش اخلاق اور عادل ہو جاتے ہیں۔ اس کو اس پر اصرار ہے اور وہ اس کی تائید کرتا ہے کہ اجتماعی اور اقتصادی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اللہ اور آخرت پر ایمان کے ذریعے انفرادی اصلاح بھی ہو اور ہر شخص اپنے نفس کی تربیت کرے، کیونکہ زندگی کے مادی اور روحانی دونوں پہلو ایسے ہیں کہ ایک کا دوسرے پر حصر رہے، اور اگر انمیں سے کسی ایک کو اس طرح نظر انداز کر دیا جائے کہ اس سے دوسرے کو ضرر پہنچے تو اجتماعی زندگی کا توازن و تناسب لازماً درہم برہم ہو جائے گا۔

مذہب اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے کہ امر المعروف اور نہی عن المنکر کیا جائے اس کو ایسی ریاست قائم کرنی پڑی جس میں دینی اور اخلاقی اغراض و مقاصد کا غلبہ تھا۔ اس کے ذریعے اس نے یہ اصول معین کر دیا کہ سیاسی اختیار اخلاقی مقاصد کے تابع ہونا چاہیئے اور یہ نہ ہو کہ مذہب کسی ایسی ریاست کے مقاصد پورے کرنے کی خدمت انجام دے جس کی نیت اخلاقی اغراض و مقاصد کی تکمیل نہ ہو۔ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ہے جس نے بین الاقوامی اخوت کو حقیقت کر کے دکھا دیا۔ اس میں جغرافیائی، قومی اور نسلی سرحدوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ مشترکہ نصب العین اور ایک تصور زندگی پر مبنی ہے۔ لہذا صرف یہی وہ برادری ہے جو حقیقی ہے اور پائیدار ہے۔ مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی وہ ایک ہے جو پجاریوں، پروہتوں اور پادریوں کے غلبے سے اور رسوم بے پایاں کے بوجھ سے آزاد ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جس میں پجاری ہوتے ہی نہیں اور یہ اس وجہ سے کہ اس نے تمام بے فائدہ مراسم کا خاتمہ کر دیا ہے

اسلام کا یہ حق ہے کہ ہر صاحب فکر اس کی طرف توجہ کرے۔ یہ صرف اس لئے نہیں کہ دنیائے عہد حاضر میں وہ سب سے زیادہ تہذیب آموز مذہب ہے اور عظیم ترین روحانی

طاقت ہے بلکہ وہ ان پیچیدہ ترین مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے جو نوع انسانی کو درپیش ہیں۔ مادی ترقی جو عہد حاضر میں نوع انسانی کا نصب العین بن گئی ہے اس سے ہرگز امن قائم نہیں ہو سکتا اور ہرگز اقوام عالم کے درمیان باہمی اعتماد پیدا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مذاہب نسل اور رنگ کے تعصبات نہیں مٹا سکے، مگر اسلام وہ ہے جو ابتدا ہی میں یہ مہم سر کر چکا[1] اور یہ اسلام ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے کہ دنیائے عہد حاضر کے یہ خطرات رفع ہوں۔ اسلام سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر بین الاقوامی مذہب ہے اور یہ اسلام کے عظیم بین الاقوامی مقاصد اور نصب العین نسلی مساوات اور اتحاد نوع انسانی کے زور ہی سے ہو سکتا ہے کہ قومی تفریق و تعصب کا یہ عذاب رفع ہو جو دنیائے عہد قدیم و حاضر کی مصائب کا باعث ہے۔

بین الاقوامی مصائب کیا، ایک قوم اور ایک ملک کے اندر بھی اس وقت تک امن نہیں رہ سکتا جب تک کہ دولت کی عادلانہ تقسیم کا بنیادی مسئلہ حل نہ ہو۔ یورپ دونوں طرف حد سے گزرا۔ اس نے سرمایہ داری اختیار کی اور کمیونزم اختیار کیا، یا ساری دولت چند بڑے سرمایہ داروں کے پاس جمع ہو جائے یا کسی کو کسی چیز کی ملکیت کا حق ہی نہ رہے اور سب چیزوں کی مالک حکومت ہو۔ یہ دونوں انتہائیں اجتماعی ناانصافی ہیں اور معاشرے کے لئے نہایت مضر۔ اسلام نے اس کا بڑا معقول حل پیش کیا ہے۔ ایک طرف مزدور کو اس نے اس کی ضمانت دیدی کہ اس کا کام تھوڑا ہو یا بہت کام کی حیثیت اور نوعیت کے مطابق اس کو معاوضہ ملے گا اور امیروں کی دولت میں غریبوں کو اس نے شریک کر دیا۔ اس طرح ملکیت کا حق بھی پوری طور پر قائم رہا، اور زکواۃ کے اصول کے مطابق امیروں کی دولت کا ایک حصہ غریبوں میں تقسیم کر کے اور مرنے کے بعد مالک کے ورثاء کو اس کی ملکیت میں کم و بیش مساوی حصہ دے کر وہ حالات پیدا کر دئے کہ دولت کی

---

[1] یا ایہا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی

تقسیم میں مساوات رہے۔ پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر۔ گب نے اپنی مشہور کتاب "وہدر اسلام"¹
کے اختتام پر لکھا ہے :-

"مغربی دنیا میں اب بھی اسلام ہی دو شدید ترین مخالف انتہاؤں کے درمیان
توازن قائم رکھے ہوئے ہے۔ وہ یورپین قوم پرستی کے اختلالی اور روسی کمیونزم کی سخت
مرکزی تنظیم کا یکساں مخالف ہے۔ وہ زندگی کے اقتصادی پہلو کے اس خبط سے اب تک
مغلوب نہیں ہوا، جو اس زمانے کے یورپ اور روس کی یکساں خصوصیت ہے۔ پروفیسر
میسگناں² نے بڑی خوبی سے اسلام کی اقتصادی اخلاقیات کا خلاصہ بیان کر دیا ہے ۔
"اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اس کی حمایت کرتا ہے کہ ہر شہری زکوٰۃ دیکر جماعت
کے وسائل میں شریک ہو جائے۔ یہ وہ خیال ہے جس سے بڑی مساوات پیدا ہوتی ہے۔
وہ بے روک ٹوک مبادلے، ساہوکاری (بنک کاری) سرمائے، حکومت کے قرضوں، اشد
ضرورت کی چیزوں پر بالواسطہ ٹیکس کا دشمن ہے لیکن وہ باپ اور شوہر کے حقوق کا، نجی
ملکیت کا، اور تجارتی سرمائے کا حامی ہے۔ بورژوا سرمایہ داری اور بالشویک کمیونزم کے
جو اصول تعلیم کئے جا رہے ہیں ان کے معاملے میں بھی اسلام راہ اوسط پر ہے ۔
(صفحہ ۳۷۸-۳۷۹)

مذہب اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک اعتقادیات اور دوسری اعمال۔ دو چھوٹے
چھوٹے فقروں میں پورے اسلام کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ لاالہ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ
محض ان دو سیدھی باتوں کے اقرار سے آدمی اسلام میں داخل ہو جاتا ہے :-
مگر ایمان کی تفصیل حسب ذیل ہے :-
(۱) اللہ کے ایک ہونے پر ایمان ۔

---

¹ Whither Islam. H. A. R. Ghibb.

² Professor Massignon.

(۲) آخرت پر ایمان۔

(۳) تمام سابقہ پیغمبروں پر ایمان اور اس پر ایمان کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخرالزماں ہیں۔

(۴) فرشتوں پر ایمان۔

ان تمام عقائد میں اللہ کی توحید کا عقیدہ بنیادی ہے۔ اسی بنیادی تصور سے تمام دوسرے عقائد، اصول اور احکام نکلتے ہیں۔ یہ ان سب کا سرچشمہ ہے۔ اگر یہ عقیدہ نکال دیا جائے تو اسلام کی پوری عمارت منہدم ہو جائے۔ اللہ نے جو قادر مطلق ہے اپنی مرضی اپنے منتخب پیغمبروں کے ذریعے سے ظاہر فرمائی اور اس طرح ہم کو صاف احکام دیئے کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اپنی آخری وحی کے ذریعے جو قرآن ہے اس نے ہم پر یہ ظاہر فرما دیا ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ اس نے ہماری اجتماعی اور سیاسی امور کی رہنمائی نام نہاد صاحب حاکمیت عوام پر نہیں چھوڑی تاکہ وہ سروں کی شمار سے معاملات کا فیصلہ کریں۔ کیونکہ حاکمیت تو صرف اللہ کے لیئے اور تنہا۔ اسی کے لئے ہے۔ اسلامی خیال کے مطابق ایک شخص کی پوری زندگی اللہ کی عبادت ہونی چاہیئے۔ نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا، صدقہ دینا اور حج کرنا، یہ سب کسی مقصد کے لئے ذرائع اور وسائل ہیں اور جب تک ہم ان کے ساتھ انفرادی، اجتماعی اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے احکام الہٰی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی پوری کوشش نہ کریں وہ بے معنی اور بے فائدہ رسمیں ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے اجتماعی اور سیاسی زندگی بھی اللہ کی حاکمیت کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔ اگرچہ مغربی تہذیب یہ چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔

مسلمان ہو کر ہم یہ نہیں کر سکتے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کا اقتدار اس طرح تسلیم کریں کہ وہ اس کا ذاتی حق ہے اور اس کو قابل اطاعت مانیں خواہ وہ پارلیمینٹ ہو

بادشاہ یا ڈکیٹر ہو یا دولت دریاست ہو۔ ہر اطاعت اور فرماں برداری اللہ اور اس کے ان احکامات کے حق میں مطلق وفاداری کے ساتھ مشروط ہے جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی فرمائے ہیں اور جو قرآن میں درج ہیں۔ دوسرے حاکموں کی فرماں برداری اور اطاعت صرف اسی حد تک کی جا سکتی ہے کہ اللہ کے احکام کے خلاف نہ ہو۔ اسطرح یہ عقیدہ کہ اللہ ایک ہے۔ عظیم سیاسی معنے کا حامل ہے۔ اس نے اس خیال کو بالکل منسوخ کر دیا ہے کہ بادشاہ کو اللہ کی طرف سے حکومت کرنے کا حق ملا ہوا ہے یا عوام کو اور پارلیمینٹ کو اقتیار حاکمیت حاصل ہے۔ اس لئے کثرت رائے سے یا اتفاق رائے سے قرآن کے قانونی یا اخلاقی قوانین میں سلمان سر مو تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اس معاملے میں قرآن کی آیتہ یہ ہے:-

" مسلمان اس پر مامور ہے کہ تمام معاملات میں قرآن اور سنت کو آخری حکم مانے۔

حیات بعد الموت اسلام کا دوسرا عقیدہ ہے اور اہمیت کے اعتبار سے توحید کے بعد اس کا صرف دوسرا درجہ ہے۔ اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کو اکثر اسلام کے تمام عقائد کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے۔ "

اس کا سبب ظاہر ہے: حیات بعد الموت پر ایمان بغیر یہ ناممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں میں یہ تحریک پیدا ہو کہ وہ اللہ کی مرضی کے مطابق عمل کریں اور اپنی زندگی اس کی مرضی کے مطابق ڈھالیں۔ اگر اس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہ ہو تو اس کوشش کے کوئی معنے نہیں کہ کوئی اچھا اور نیک بنے۔ کیونکہ نیکی اور پاکی یا خوش اعمالی کا اجر ضروری نہیں ہے کہ اسی دنیا میں ملے۔ علاوہ ازیں، اگر کسی معاشرے میں لوگوں کا ایمان حیات بعد الموت پر نہ ہو تو ان پر اس کے لئے کوئی اخلاقی روک ٹوک نہیں ہوتی کہ وہ بداعمالی سے بچیں، بشرطیکہ ان کو یہ یقین ہو کہ حکومت کے عمال ان کو گرفتار نہ کر سکیں گے۔

اس کے برخلاف ایسے معاشرے میں جہاں لوگوں کو حیات بعد الموت پر پختہ یقین ہو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ بداعمالی کریں۔ کیونکہ ان کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ وہ سب دیکھ رہا ہے جو وہ کر رہے ہیں یا نہیں کر رہے ہیں اور آخرت میں ان کو اس دنیا سے زیادہ سخت سزا ملے گی۔

اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ پیغمبروں پر ایمان ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر ملک اور قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے۔ تمام پیغمبروں پر اللہ کی طرف سے وحی آئی تھی اور بنی نوع انسان کیلئے سب کو ایک سا پیغام ملا مگر اتنے تغیر کے ساتھ جتنی کہ اس وقت کے معاشرتی حالات کے اعتبار سے ضرورت تھی۔ سب نے اس ایک ہی مقصد کے لیے کوشش کی کہ لوگ اللہ کی وحدت پر ایمان لائیں اور سوائے اللہ کے کسی اور کی اطاعت نہ کریں۔ پیغمبروں پر ایمان میں بڑے گہرے معنے پوشیدہ ہیں اسی وجہ سے اس پر بڑا اصرار ہے۔ صرف یہی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغام الٰہی کے حامل ہیں بلکہ انہی نے یہ بھی بتایا کہ عملی زندگی میں اس کی کیا تعبیر ہے۔ اس لیے ان کی حیات طیبہ اسوہ حسنہ ہے اور ان کا اتباع مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال سے ان کے امتیوں کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور ان کی زندگیوں میں واقعی انقلاب ہو جاتا ہے اور چونکہ انسانوں کی اصلاح یا ان کی زندگیوں میں بھی ایسے ہی کے ذریعے سے تغیر ہو سکتا ہے جو انہی جیسا، یعنی ان کا ہم جنس ہو۔ اس لئے قرآن کا اصرار ہے کہ پیغمبر انسان ہی ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر ہیں۔ ان کے ذریعے سے اللہ نے بنی نوع انسان کو اپنا پورا پیغام پہنچا دیا۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ وسلم تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوئے۔ دوسرے پیغمبروں کی زندگیاں تاریخ کی دسترس سے باہر اور پردہ خفا میں ہیں۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں نے ان کے نجی اور پبلک کردار اور طرز عمل کی ہر خصوصیت بڑی تفصیل

سے محفوظ کردی ہے۔ کسی دوسرے شخص کا کردار اس طرح عوام کی نظر کے سامنے کھلا ہوا نہیں ہے۔ یہ وہ بات ہے جس میں آپ کی کوئی نظیر نہیں ہے اور اسی سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ آپ اس کمال کا نمونہ ہیں جو زیادہ سے زیادہ انسان کے لئے ممکن ہے۔ قرآن مسلمانوں کو صاف الفاظ میں یہ حکم دیتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں اور اتباع کے لئے آپ کی سیرت طیبہ پیش نظر رکھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہا اور جو کیا اسے سنت کہتے ہیں اور تمام انفرادی، معاشرتی اور سیاسی معاملات میں قرآن کے بعد وہی قطعی حجت ہے۔

اسلام کے ارکان میں چوتھا اللہ کی کتابوں پر ایمان ہے۔ بہت سے پیغمبروں پر کتابیں نازل ہوئیں۔ ان میں قرآن سب سے آخری ہے اور آج تک بالکل اسی طرح موجود ہے جس طرح کہ یہ نازل ہوا، ہر قسم کے تغیر و تبدل سے پاک۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی مشہور غیر مسلم علماء نے بھی تصدیق کی ہے۔ وہ اس سے انکار نہیں کرتے کہ یہ لفظ بلفظ وہی کتاب ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی گئی۔ اس عظیم کارنامے کے باعث مسلمانوں کا معمول ہے کہ وہ قرآن کو حفظ کرتے ہیں۔ بعض پورا، اور اکثر اس کے اجزاء۔

تمام معاملات میں قرآن آخری حکم ہے۔ جن معاملات میں مسلمانوں کے درمیان نزاع یا اختلاف رائے ہو قرآن کا فیصلہ قطعی اور آخری ہے۔ جن معاملات کے متعلق قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند حدیثوں میں کوئی متعین ہدایت نہ ہو ان میں بے شک مسلمان اپنی عقل و رائے سے کام لے سکتے ہیں۔ لیکن جن معاملات میں قرآن و حدیث کا فیصلہ صاف اور واضح ہے ان میں مسلمانوں کا کام بس یہی ہے کہ وہ مانیں اور فرماں برداری کریں۔ ایسے تمام معاملات میں عقل و رائے کا کام صرف اس قدر ہے کہ ایسے خاص قسم کے مقصد اور نیت کو سمجھا جائے اور اس کی تعمیل کے لئے جو بہترین ذرائع اور وسائل

ہوں وہ تلاش کئے جائیں۔ صرف یہ ہی نہیں کہ دوسرے تمام معاملات میں مسلمانوں کو عقل و رائے سے کام لینے کی اجازت ہے بلکہ ان کو حکم ہے کہ ایسا کریں بشرطیکہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی اور اس کی اسپرٹ کی خلاف ورزی نہ ہو۔ عقل و رائے کو اسلام نے اپنے دائرے سے خارج نہیں کیا ہے بلکہ صرف وحی الٰہی کے تابع کر دیا ہے۔ اس طرح قرآن وہ کسوٹی اور وہ معیار ہے جس پر سچا مسلمان ہر چیز کو جانچتا ہے۔

قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے صرف وہ بڑے اصول اور وہ پالیسی متعین کر دی گئی ہے جن کی مسلم معاشرے کو پیروی کرنی ضروری ہے۔ تفصیلات کے تعین کا کام اس وقت کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ حالات کا تقاضہ ہو۔ اس طرح اگر کوئی خاص قانون، حالات تبدیل ہونے کی وجہ سے وہ اثرات و نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہو جائے، جو مطلوب تھے تو اس کو اس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے کہ اس سے پھر وہی مقصد پورا ہونے لگے جو مدنظر تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ قانون کا مقصد وہی رہے جو تھا، نئی صورت حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے باتفاق رائے قانون تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر اتفاق رائے کے معنی بالغ آبادی کی رائے کی اکثریت یا ان ممبروں کی رائے کی اکثریت نہیں ہے جو اس بنا پر پارلیمنٹ کی تشکیل کے لئے منتخب کئے گئے ہوں۔ اس کے معنے ان لوگوں کی اکثریت کی رائے ہے جو اپنے علم و تقوے کے اعتبار سے اُمت کے معاملات میں رائے دینے کے اہل ہیں۔ مزید براں یہ کہ یہ اتفاق رائے قرآن کے صاف فیصلے کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔

قرآنی اصولوں کا حسن یہ ہے کہ وہ چونکہ اللہ کی طرف سے ہیں اس لئے وہ ہر شخص پر یکساں منطبق ہوتے ہیں خواہ اس کا کوئی مقام ہو، کوئی رنگ ہو، کوئی نسل ہو، کوئی صنف ہو یا کوئی زبان اور قومیت ہو۔ بالفاظ دیگر اس وجہ سے کہ قانون وضع کرنے کا محدود ملت مسلمہ کے نہایت درجہ صاحب علم اشخاص ہی کو سونپا گیا ہے، اسلامی معاشرہ

میں کوئی شخص ان معنے میں واضح قانون یا صاحب حاکمیت نہیں ہو سکتا جو دورِ حاضر میں ان الفاظ سے مفہوم ہیں۔ ایسی سوسائٹی میں جو حاکم یا حکام ہوں گے وہ صرف قانون کا عمل درآمد یا نفاذ کرنے والے سمجھے جائیں گے۔ اللہ کی وحدت اور اللہ کی حاکمیت پر ایمان رکھنے کا نتیجہ ایسے پاکیزہ معاشرے کی تخلیق تھا جو برادری، برابری، آزادی، اجتماعی انصاف اور رواداری کی بنیاد پر ایک دولت قائم کر سکا۔

ایمان کے جتنے ارکان ہیں وہ حقیقت میں عمل کے اصول ہیں۔ وہ پانچ بنیادی فرائض مذہبی جو اسلام نے تسلیم کیے ہیں یہ ہیں۔ نماز، زکواۃ، روزہ، حج اور جہاد۔ جہاد اجتماعی فریضہ (فرض کفایہ) ہے اور بقیہ ابتدائی چار انفرادی فرائض ہیں اگرچہ اجتماعی اعتبار سے بھی ان کا بڑا اہم نفع ہے۔ ان چاروں میں بھی نماز کا بلاشبہ بڑا اہم مقام ہے اور زکواۃ کا درجہ اس کے بعد ہے۔

اسلام میں نماز کے دو حصے ہیں، ایک وہ ہے جو خلوت میں ادا کی جائے اور دوسری وہ جماعت کے ساتھ اور افضل یہ ہے کہ مسجد میں۔ خلوت کی نماز محض باطن کی ترقی کے لئے ہے اور جماعت کی نماز میں باطن کی ترقی کے ساتھ دوسرے مقاصد بھی مدِ نظر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے اسلامی عبادت (نماز) نسل انسانی کو متحد کرنے کے لئے بڑی زبردست طاقت بن گئی ہے۔ سب سے پہلے تو ایک محلہ کے آدمیوں کا نماز میں روزانہ پانچ وقت جمع ہونا اس کا باعث ہوتا ہے کہ ان کے درمیان بہت اچھے معاشرتی تعلقات قائم ہوں۔ مگر جمعہ کی نماز میں اسکا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ چھوٹی بستی کے تمام اور بڑی بستی یا شہر کے بڑے حصے کے لوگ ایک مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ عید اور بقر عید کی نمازوں کا اجتماع اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے ان مواقع پر سر دولت یا اس کا نمائندہ خطبہ دیتا ہے۔ اسطرح مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے درمیان معاشرتی تعلقات میں ترقی ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ جماعت کی نماز سے معاشرتی اونچ نیچ ہموار ہوتی رہتی ہے۔ مسجد کے دروازے میں داخل ہوتے

ہی ہر مسلمان محسوس کرتا ہے کہ وہ مساوات کی فضا میں ہے۔ اللہ کے سامنے سب شانہ بہ شانہ کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہ اپنی مفلس ترین رعایا کے برابر، امیر فقیر کے اور گورا کالے کی۔ ایسا کوئی دوسرا اثر نہیں ہو سکتا جس سے اتنی ہمواری پیدا ہو۔ مرتبے، دولت اور رنگ کے تمام اختلافات مسجد کے اندر مٹ جاتے ہیں اور اسی پاک عمارت میں اخوت اور مساوات اور محبت کا نیا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

زکواۃ

خیرات کو قرآن میں اسلام کا دوسرا عظیم رکن قرار دیا گیا ہے۔ وسیع معنوں میں خیرات ان تمام کاموں پر حاوی ہے جو عمومیت کے ساتھ بنی نوع انسان کے حق میں سخاوت کے طور پر کئے جائیں اور لوگوں کے بھلے کے لئے ہوں۔ ان معنوں میں خیرات کہ اپنی دولت اہل ضرورت کو دی جائے دو قسم کی ہوتی ہے: ایک وہ جو فرض ہے اور دوسری وہ جو اپنی خوشی سے دی جائے۔

فرض خیرات کو زکواۃ کہتے ہیں۔ امیروں پر یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ اپنی دولت کا چالیسواں حصہ بیت المال میں داخل کریں جس کا انتظام حکومت کرتی ہے اور وہ مندرجہ ذیل آٹھ مدات پر خرچ کی جاتی ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے۔

انما الصدقات للفقراء والمسکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم و فی الرقاب والغارمین و فی سبیل الله وابن السبیل (سورۃ توبہ رکوع ۸)

زکواۃ کا عمل صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے (معاشی) ہمواری ہوتی ہے بلکہ جماعت کی عام خوش حالی کے ساتھ اس سے انسانوں کے دلوں میں انسانوں کے لئے محبت اور ہمدردی کے بلند جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت کی ملکیت اور دولت کی جبری تقسیم کے سخت نظام سے انسان کی تمام اعلیٰ عملی بیتیں فنا

ہو جاتی ہیں۔

صوم یا روزہ

صوم کے اصل معنے کلی طور پر رک جانا یا باز رہنا ہیں اور اس میں کھانا پینا، بولنا اور چلنا پھرنا بھی داخل ہے۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں صوم کے معنے ہیں کھانے پینے اور جماع سے باز رہنا از صبح صادق تا غروب آفتاب۔

از روئے اسلام روزے کا پہلا مقصد روحانی تربیت ہے۔ اس کی تہہ میں اخلاقی تہذیب بھی ہے۔ کیونکہ اسی سے انسان کو اس کی تربیت ہوتی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی مفلسی اور احتیاج میں صبر کرے اور سخت سے سخت امتحان میں پورا اترے اور ان چیزوں پر ہرگز دست درازی نہ کرے جو جائز نہیں ہیں۔ یہ سبق ایک مہینے تک روزانہ دہرایا جاتا ہے اور جس طرح جسمانی ورزش سے آدمی جسم میں طاقتور ہو جاتا ہے، روزے کے ذریعے اخلاقی ورزش کرکے اخلاقی طاقت ور ہوتا ہے۔ روزے سے اس خیال کو بڑی قوت پہنچتی ہے کہ ہر ناجائز چیز سے بچنا اور ہر برائی سے نفرت کرنا چاہیئے۔

حج

حج کے لغوی معنے ہیں کسی چیز کو دیکھنے کے لئے جانا اور شریعت اسلامیہ کی اصطلاح میں حج کے معنے ہیں (ایک وقت معینہ پر) بیت اللہ کی زیارت کو جانا اور وہ تمام عبادتیں کرنا جو اس موقع کے لئے خاص ہیں۔ ایک معروف کی حیثیت سے حج بہت ہی قدیم زمانے سے موجود تھا۔ یہ متبرک مسجد (جس کا نام کعبہ ہے) اسلام سے قبل تمام انتظامی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ کیونکہ اسی کی حدود کے اندر دارالندوہ بھی تھا جس میں لوگوں کے تمام اہم معاملات طے ہوتے تھے۔ آغاز اسلام کے بعد خانہ کعبہ مکہ کی تمام ذہنی سرگرمیوں

کا محور بن گیا اور تمام مسلم دنیا اس کو اپنا مرکز سمجھنے لگی۔

نسل، رنگ، صنف، منصب، اور ملک کے امتیازات رفع کرنے میں کسی انسٹی ٹیوشن کا ایسا حیرت انگیز اثر نہیں ہے جیسا حج کا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ تمام اور ہر ممالک کے لوگ مقدس بیت اللہ کے سامنے اللہ کے بندوں کی حیثیت سے اس طرح جمع ہوتے ہیں کہ گویا ایک مذہبی کنبہ ہیں، بلکہ ان سب کا لباس بھی ایک ہوتا ہے۔ بس دو سفید چادریں جن میں کوئی سلائی نہیں ہوتی۔ اس سفید بغیر سلے ہوئے لباس میں جسکو احرام کہتے ہیں اس کی کوئی تمیز نہیں رہتی کہ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا آدمیوں کا عظیم مجمع ہوتا ہے۔ سب ایک لباس میں ہیں، سب ایک سمت کو چل رہے ہوتے ہیں، سب کی زبان پر ایک قول ہے: لبیک اللہم لبیک۔ جو بات دوسری طرح ناممکن ہے حج میں ممکن ہو جاتی ہے کہ تمام لوگ جو مختلف ملکوں اور مختلف حیثیتوں اور طبقوں کے ہوتے ہیں، ایک لباس پہنتے ہیں اور ایک زبان بولتے ہیں۔ اس طرح ہر مسلمان کو (جس پر حج فرض ہو جائے) زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ مساوات کے تنگ دروازے سے گذرنا پڑتا ہے، جس سے نہایت درجہ گہری اخوت پیدا ہوتی ہے۔ سب آدمی پیدائش میں اور موت میں برابر ہیں۔ وہ ایک طرح زندگی میں قدم رکھتے ہیں اور ایسے ہی ایک طریقے پر وہ اس زندگی سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن حج وہ ایک ہی موقع ہے جس میں ان کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ کیسے ایک طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور ایک طرح عمل کرتے ہیں اور ایک طرح سے محسوس کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے یہ تمام عقائد و اعمال صرف یہ ایک معین مقصد حاصل کرنے کے لئے ہیں کہ اس پاکیزہ اور خوش اخلاق معاشرے کی پیداوار ہونے کی بنا پر جس کا یہ واجبی وظیفہ ہے کہ برائیوں سے روکا جائے اور نیکی کا حکم کیا جائے، ان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دیں خواہ وہ ذہنی ہو، جسمانی ہو،

معاشی ہو یا ثقافتی۔ قرآن کی ایک آیت میں مسلمانوں کو بہترامت قرار دیا گیا ہے جو بنی نوع انسان کی طرف اس لئے بھیجی گئی ہے کہ نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔ اس آیۂ کریمہ نے مسلم معاشرے پر یہ عظیم ذمہ داری عائد کر دی ہے کہ جہاد کرے اور دنیا کو برائی کی تمام طاقتوں سے پاک کر دے۔

جہاد

لفظ جہاد جہد یا جُہد سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں قابلیت، پوری طاقت سے کوشش کرنا اور جہاد اور مجاہد کے معنے ایسے دشمن کو دفع کرتے ہیں اپنی پوری طاقت سے کام لینا۔ جہاد تین طرح کا ہوتا ہے یعنی۔ (۱) جنگ جاری رکھنا کسی ظاہر دشمن کے خلاف (۲) شیطان کے خلاف (۳) اپنے نفس کے خلاف۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی تبلیغ ہر سچے مسلمان کے لئے مذہبی فریضہ ہے اور اس میں اسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنی چاہیئے لیکن اشاعت اسلام میں جبر اور زبردستی سے احتراز واجب ہے۔ قران فرماتا ہے :۔

لا اکراہ فی الدین (پ۳ رکوع ۲)

مگر پھر بھی جنگ کرنا زندگی کی ایک ضرورت ہے اور ایسے وقت آتے ہیں کہ انصاف کے لئے لڑنا، مظلوم کی مدد کے لئے لڑنا، حفاظت خود اختیاری کے لئے لڑنا ضروری ہو جاتا ہے اور یہ حقیقی معنے میں بڑے اور شریف ترین اعمال ہیں کیونکہ ان میں حق کے لئے اور انصاف کے لئے آدمی اپنی جان دے دیتا ہے اور یہ آدمی کے لئے سب سے بڑی قربانی ہے۔

ان بڑے مقاصد کے لئے کام کر کے مسلمان ایک ایسا صالح معاشرہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے جس نے وہ ریاست قائم کرنے میں ان کی مدد کی جس کے بنیادی اصول

لہ کنتم خیرا امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (پ ۴، ر۲)

اخوت، مساوات، آزادی، اجتماعی انصاف اور رواداری تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی۔ مسلمان ایک ہزار برس سے زیادہ برسرِ اقتدار رہے اور فکر و عمل میں انہوں نے دنیا کی قیادت کی۔ تہذیب حاضر کی تعمیر میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے مدینے میں ایک ریاست قائم کی اور پھر پورے عرب میں جو قرآن کے ان بنیادی اصولوں پر مبنی تھی۔ آئندہ باب میں ان تنصیبات سے بحث کی جائے گی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھیں۔

باب ۲

اسلامی تنظیمات عہد رسالت میں

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیروؤں پر بیہمانہ مظالم نہ برداشت کر سکے اور آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ مکے کے مخالفانہ حالات میں آپ کے لئے اسلام کی تبلیغ ناممکن ہے تو آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ مدینے کو ہجرت کریں جہاں حالات نے مذہبی سرگرمیوں کے لئے ایک نیا میدان پیدا کر دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں آپ مختلف عرب قبائل کی قرارگاہوں میں تشریف لے جاتے۔ اور وہاں ان سے مذہب پر گفتگو کرتے۔ ان میں سے بعض نے لاپروائی برتی اور بعض نے حقارت سے آپ کا پیغام رد کیا۔ لیکن کامیابی کی صورت پیدا ہوئی ایسی جگہ سے کہ جہاں سے کوئی توقع نہ تھی۔ پانچ چھ آدمیوں کے ایک گروہ سے آپ کی ملاقات ہوئی جن کو آپ نے پہچان لیا کہ مدینے سے آئے ہیں اس زمانے میں مدینہ یثرب کے نام سے مشہور تھا۔ وہ آپ کی تبلیغ سے متاثر ہوئے اور ایمان لے آئے۔ اسی واقعے سے حالات نے پلٹا کھایا۔ ان لوگوں نے یہودیوں کی پیشگوئی

سُنی تھی کہ کوئی پیغمبر عنقریب مبعوث ہونے والے ہیں اس لئے انھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ مسلمان ہوئے بلکہ وہ اسلام کے مبلغ بن گئے اور واپسی کے بعد انہوں نے مدینے کے لوگوں میں تبلیغ شروع کردی۔ ان کی کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ مدینے میں مشکل ہی سے کوئی ایسا گھر باقی رہا جس میں محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں ہوا۔ جب حج کا زمانہ پھر آیا، تو ایسے مقام پر جو پہلے سے معین ہو چکا تھا اہل مدینہ کا ایک وفد آپ سے ملا۔ جس میں دس آدمی قبیلہ بنو خزرج کے تھے اور دو بنو اوس کے۔ اس طرح معاہدۂ عقبہ ہوا جو سب سے پہلا تھا۔ اس کا مضمون حسب ذیل تھا: "ہم سوائے اللہ کے جو ایک ہے اور کسی کی عبادت نہیں کریں گے، ہم چوری نہیں کریں گے اور نہ زنا کریں گے اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گے، ہم نہ چغلی کھائیں گے اور نہ غیبت کریں گے ہم ہر اس بات میں جو حق ہوگی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کریں گے۔"

جب یہ بارہ آدمی یثرب واپس پہنچے تو ان کے ساتھ مصعب بھی تھے جو بہت ہی ابتدائی زمانے میں ایمان لائے اور حال ہی میں حبشہ سے واپس آئے تھے۔ تبلیغ اسلام کی بنیاد ایسی اچھی رکھی گئی تھی اور ان لوگوں نے ایسے جوش سے کام کیا تھا کہ اسلام ہر گھر میں اور ہر قبیلے میں پہنچ گیا۔ ایک سال کے اندر ایسی کامیابی ہوئی کہ مدینے کے عربوں کا کوئی گھر ایسا نہیں رہا کہ جس کا کوئی نہ کوئی آدمی یا کئی آدمی دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہو گئے ہوں۔

اس کے بعد جب پھر حج کا زمانہ آیا تو کفار کے ساتھ ساتھ ستر مسلمان بھی یثرب سے مکہ آئے۔ مسلمانان یثرب نے ان کو اس خدمت پر مامور کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دیں کہ ہجرت کرکے یثرب تشریف لے آئیں اور اس شہر کو اسلامی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔ یہ وفد اس لئے آیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس کے لئے بیعت کرے کہ وہ ان کو پیغمبر اور اپنا پیشوا مانتا ہے۔ ان کے ساتھ

مصعب بھی تھے۔ مکہ پہنچتے ہی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اس کامیابی کا ذکر کیا جو ان کو یثرب میں ہوئی تھی۔ اس خیال سے کہ قریش کو شبہات پیدا نہ ہوں عقبہ میں جہاں سال گزشتہ یثرب کے نو مسلموں سے ملاقات ہوئی تھی ایک خفیہ اجتماع کا اہتمام کیا گیا۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا عباس کے ساتھ اس خفیہ مقام میں وفد سے ملے اور اچھی طرح گفت و شنید کے بعد وہ معاہدہ ہوا جو بیعت عقبہ ثانی کے نام سے مشہور ہے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تیرھواں سال تھا جب مدینے کے دونوں بڑے قبائل اوس اور خزرج کے سرداروں اور آپ کے درمیان معاہدہ ہوا۔ مسلمانان مدینہ کے نمائندوں نے آپ کو مدینے آنے کی دعوت دی۔ احکام اسلامی کی پابندی کا وعدہ کیا اور یہ ذمہ داری لی کہ تمام دشمنوں اور بالخصوص قریش کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں گے۔ مسلمانان مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر کی حیثیت سے اپنا مذہبی اور سیاسی لیڈر بھی تسلیم کیا۔ اسی وقت انہوں نے آپ سے یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ ان کو کبھی نہ چھوڑیں گے اور مدینے سے مکہ واپس نہیں آئیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ شرط منظور فرمائی اور ان الفاظ میں عہد فرمایا۔

"نہیں زندگی اور موت میں میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم میرے ساتھ ہو۔ میں اس سے لڑوں گا جس سے تم لڑو گے اور میں اس سے صلح کروں گا جس سے تم صلح کرو گے"

اس پر مدینے کے ان تمام لوگوں نے جو عقبہ میں موجود تھے اپنے ہاتھ بڑھائے اور مندرجہ ذیل الفاظ میں رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی:۔ "ہم عہد کرتے ہیں کہ راحت میں اور مصیبت میں آپ کا فرمان سنیں گے اور آپ کی اطاعت کریں گے اور خوشی میں ہوں یا تکلیف میں آپ کا ساتھ دیں گے اور ہم کہیں ہوں سچ بولیں گے اور اللہ کی راہ میں کسی

ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔"

اس طرح مکہ سے روانہ ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نمائندگان مسلمانان مدینہ کے درمیان یہ پہلا معاہدہ ہوا۔

قریش کو جس وقت ان خفیہ معاملات کا علم ہوا تو انہوں نے مسلمانوں پر از سر نو مظالم شروع کر دیئے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ آہستہ آہستہ اور خفیہ طور پر مدینے کو ہجرت کریں۔ اس طرح وہ دو دو تین کر کے خاموشی سے مدینے پہنچنے لگے جہاں مسلمانان مدینہ نے دلی جوش سے ان کا خیر مقدم کیا۔ ان کے درمیان اس پر مسابقت ہونے لگی کہ ان کی میزبانی کی عزت کس کو حاصل ہو اور ان کی ضرورت کی چیزیں کون مہیا کرے۔ دو مہینے کے اندر سوائے ان کے جو گرفتار اور قید کر دیئے گئے یا قید سے بچ کر نہ نکل سکے، تمام مسلمان مکے سے روانہ ہو گئے۔ مہاجروں کی تعداد ایک سو پچاس تھی۔

محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی روانگی میں اس وجہ سے تاخیر فرماتے رہے کہ تمام مسلمان نکل جائیں۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ قریش نے بڑے اہتمام سے آپ کے قتل کی سازش کی ہے تو آپ بھی بڑی تدبیر کے ساتھ روانہ ہوئے۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہولناک حالات میں مکے سے روانہ ہوئے اور دشمنوں سے آپ کی جان کو خطرہ تھا مگر پھر بھی آپ کا طرز عمل ایسا رہا جو آپ کی اخلاقی بلندی اور حق کے ساتھ شیفتگی کا بین ثبوت ہے۔ آپ نے حضرت علیؓ کو ہدایت فرمائی کہ آپ کے بستر پر رات گزاریں اور جن لوگوں کی امانتیں آپ کے پاس تھیں وہ ان کو واپس کر دیں۔ بعثت سے قبل قریش آپ کو الامین کہتے تھے۔ اس طرح آپ نے اپنے اس لقب کی شان قائم رکھی۔

حضرت علیؓ نے ہدایت کے مطابق عمل کیا مگر آپ کی امانت و دیانت سے بھی

کفار قریش کا غصہ فرو نہیں ہوا - وہ یہ جانتے تھے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اس وقت تک اسلام کا پیغام جو اپنے لئے ان کو سخت خطرناک معلوم ہو رہا تھا، پھیلتا ہی رہے گا - اس لئے انہوں نے آپ کا تعاقب شروع کیا اور یہ اعلان کیا کہ آپ کو جو کوئی گرفتار کرے گا اس کو انعام دیا جائے گا - اور یہ بڑا انعام تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی حفاظت میں سلامتی کے ساتھ مدینے پہنچ گئے -

لیکن مدینے میں آپ کو جو کام کرنا تھا وہ واقعی بڑا سخت اور عظیم تھا - پہلی مہم یہ تھی کہ مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کی جائے - اس کے بعد یہ کہ مدینے کے یہودیوں اور دوسری غیر مسلم جماعتوں سے دوستی اور باہمی حفاظت کے لئے معاہدات ہوں - ان سب کی ضرورت اس لئے تھی کہ اس جماعت مسلمین کی حفاظت ہو سکے جو بروئے کار آرہی تھی، اور تمام دنیا میں اسلام کی اشاعت - مدینے کے عربوں کی سوسائٹی میں چونکہ بڑا اختلال تھا اس وجہ سے یہ کام بڑا مشکل تھا - اوس اور خزرج کوئی بارہ شاخوں میں منقسم تھے اور یہودی دس میں، اور ان سب پر صدیوں پرانی روایات کا انبار لدا ہوا تھا، اور یہ روایات وہ جنگیں تھیں جو ختم ہونا جانتی ہی نہ تھیں - ان کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ بعض عرب قبائل اپنے عرب دشمن قبائل کے مقابلے میں یہودیوں کی مدد حاصل کرتے تھے اور اسی طرح وہ دشمن قبائل بھی - اس مسلسل خانہ جنگی اور خون ریزی سے لوگ تنگ آگئے تھے اور چاہتے تھے کہ حالات تبدیل ہوں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے کچھ ہی قبل مدینے کے بہت سے لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ عبد اللہ بن اُبی بن سلاصل کو اپنا فرمانروا بنائیں اور اس حیثیت سے اسکی تاج پوشی کریں - مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بیعت عقبہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب قبائل کے بارہ فریقوں کے بارہ سردار نامزد کئے تھے اور اس طرح ان کے درمیان اتحاد کی کوشش فرمائی تھی - اس کے باوجود ہر قبیلے کو اپنے داخلی امور میں

پوری خود اختیاری حاصل تھی اور کوئی ایسا انتظامی نظام موجود نہیں تھا جو ان تمام قبائل اور فرقوں کے درمیان ربط قائم رکھے۔ اگرچہ تربیت یافتہ مسلمان مبلغوں کی کوششوں سے مدینے کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا، تاہم اس نئے مذہب نے کوئی سیاسی رخ اختیار نہیں کیا تھا۔ حالات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے سخت کام کا بار ڈال دیا کہ آپ سے قبل کسی نبی نے اپنے ذمہ نہیں لیا تھا۔ آپکو اختلال سے تنظیم، کمزوری سے طاقت اور افتراق و تشتت سے اتحاد پیدا کرنا تھا۔ خود اللہ نے قرآن میں اس بھاری بوجھ کا ذکر فرمایا ہے جس سے آپ کی کمر جھکی جا رہی تھی۔

وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ (سورۃ الم نشرح ۲-۳)

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں کام شروع کیا مندرجہ ذیل مسائل آپ کی فوری توجہ کے محتاج تھے۔

(۱) ایک مسجد کی تعمیر جو مسلمانوں کے لئے مرکز اجتماع ہو۔

(۲) مہاجرین کی مدینے میں آبادکاری۔

(۳) مہاجرین اور انصار کے درمیان اپنے اور تمام مسلمانوں کے درمیان حقوق و فرائض کا صاف صاف تعین۔

(۴) غیر مسلموں اور خصوصاً مدینے کے یہودیوں کے ساتھ معاہدات

(۵) مدینے کے انتظام اور تحفظ کے لئے انتظامات۔

مسجد

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جو مندرجہ ذیل آیۂ قرآنی[۱] میں درج ہیں مدینے پہنچنے کے بعد سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی تعمیر کا کام انجام دیا

---

[۱] مسجد اسس علی التقوی من اول یوم

آپ نے اپنے پیروؤں پر یہ واجب قرار دیا کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں تاکہ امام کی قیادت میں وہ مساوات، اخوت، آزادی، اجتماعی اتصاف، تنظیم اور اطاعت سیکھیں۔ مدینے کی مسجد راست آپ کی امامت اور انتظام میں تھی اور دوسری مسجدوں کے لئے آپ نے ایسے امام مقرر فرمائے جو بڑے صاحب تقوٰے اور صاحب علم تھے تاکہ وہ مقتدیوں کو صحیح علم سکھا سکیں۔ جمعہ کے روز مدینے کی مسجد میں خود آپ ہی خطبہ دیتے تھے اور عرب کی تمام دوسری مسجدوں میں آپ کے نمائندے جنہیں وہ قرآن کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات لوگوں کو سمجھاتے تھے مسجد مذہبی مرکز ہونے کے علاوہ مسلمانوں کا ثقافتی مرکز بھی تھی۔ یہاں ان تمام مسائل میں ان کی تربیت ہوتی تھی جو جماعت مسلمین کی فلاح اور خوش حالی سے متعلق تھے۔ جمعہ کا خطبہ ان تمام مسائل پر باضابطہ ہفتہ وار لیکچر ہوتا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد طیبہ میں جب مسلمانوں کو کسی اہم بات کی اطلاع دینی مقصود ہوتی تھی تو اس کے متعلق مسجد میں خطبہ دیا جاتا تھا۔ حتےٰ کہ اپنی آخری علالت کے دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور آپ نے خطبہ دیا۔

اس طرح عوامی پیمانے پر تعلیم کے علاوہ مسجد نبوی میں اس کا انتظام بھی تھا کہ جو لوگ علم حاصل کرنا چاہیں وہ کر سکیں۔ وہ لوگ جن کی مبلغین کی حیثیت سے تعلیم و تربیت ہوتی تھی کہ دنیا کے بعید مقامات میں اسلام کی روشنی اور علم پہنچائیں انکو صفہ پر ٹھہرا دیا جاتا تھا۔ یہ مسجد سے ملحق ایک چبوترہ تھا۔ تمام اہم قومی مسائل مسجد میں طے ہوتے تھے۔ جب مسلمان جہاد کرنے پر مجبور ہوئے تو دفاع اور مہم کے تمام مسائل پر مسجد میں اتفاق رائے ہوا۔ اہم خبریں سنانے کے لئے لوگوں کو مسجد میں بلایا جاتا تھا مسجد سے دارالشوریٰ کا کام لیا جاتا تھا۔ مسلم اور غیر مسلم قبائل کے وفود سے رسول اللہ انکو

صلی اللہ علیہ وسلم مسجد ہی میں ملتے تھے اور بعض زیادہ اہم وفود مسجد ہی میں ٹھہرائے بھی گئے۔ امور عدلیہ بھی مسجد میں طے ہوتے تھے اس طرح مسجد مسلمانوں کا صرف مذہبی مرکز ہی نہیں بلکہ سیاسی، تعلیمی، ثقافتی، معاشرتی اور فی الحقیقت صحیح معنےا میں اور نہایت جامعیت کے ساتھ مسلمانوں کا قومی مرکز تھی۔

اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی اصلاح کر کے انکو اس قابل کرتے ہیں کہ وہ ان تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کریں جو اللہ کی طرف سے ان پر عائد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد ہی کی تنظیم کے ذریعے سے کامیاب ہوئے۔

دوسرا کام جو آپ نے اپنے ذمے لیا تھا وہ مہاجرین اور انصار کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم کرنا تھا۔ قرآن کے حکم کے مطابق آپ نے فرمایا :۔ مسلمان اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ایک برادری ہیں۔ اس لئے اپنے بھائیوں کے درمیان امن و اتحاد قائم کرو اور اللہ کی حمد کرو تاکہ وہ تم پر رحم کرے[1]۔ اسلام چونکہ بنی نوع انسان کی برادری ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی اور مدنی، قریش اور اوس و خزرج کے تمام امتیازات مٹا کر اس کی پرورش فرمائی۔ دو دو مسلمانوں کو باہم اسلامی بھائی قرار دے کر ایک نئی برادری پیدا کی گئی۔ ہر مہاجر کا ایک انصاری بھائی تھا۔ اس سے انصار کا اخلاقی وقار بڑھا اور مہاجرین کی مادی خوشحالی میں ترقی ہوئی۔ یہ اپنے ان رشتہ داروں کے مقابلہ میں جن سے خون کا رشتہ تھا ان کے ساتھ زیادہ محبت کرتے تھے اور اس لئے کہ یہ محبت اللہ کے واسطے تھی نہ کہ خون کے رشتوں اور قبائلی اور خاندانی مفاد کے لئے، انصار نے بطیب خاطر یہ پیش کش کی کہ

---

[1] انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون — سورۂ حجرات رکوع ۱ آیت ۱۰

کر ان کی تمام دولت میں اور ان چیزوں میں جو ان کے پاس تھیں مہاجرین برابر کے شریک ہو جائیں لیکن مہاجرین اپنے میزبانوں پر بار ہونے والے نہ تھے۔ وہ بہت جلد اپنے انصاری بھائیوں کی مدد سے مختلف پیشوں میں لگ گئے اور اس سے انہوں نے خود ہی نفع نہیں اٹھایا بلکہ اس شہر کی خوشحالی کا باعث ہوئے جس کو انہوں نے اپنا وطن بنالیا تھا

ایک سو پچاس کے قریب مسلمانوں نے مکے سے ہجرت کی تھی ان میں سوائے حضرت ابوبکر رضا اور حضرت عثمان رض کے اور کسی کے پاس اپنے وسائل نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارے کی اس ایک تدبیر سے مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ حل کر دیا۔

آئینی حکومت

آبادکاری کا مسئلہ حل کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام ہاتھ میں لیا کہ اہل مدینہ کو آئینی حکومت دیں۔

مدینے پہنچنے کے چند ماہ بعد آپ نے اس مقصد سے ایک منشور مرتب فرمایا جس کے عملاً یہ معنے تھے کہ مدینے کو ایک کامل شہری ریاست کا مرتبہ حاصل ہو گیا جس کے لئے کوئی دستور وضع ہونا تھا۔

اس منشور کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں جو مہاجرین اور انصار کے معاملات سے متعلق تھا۔ ۲۳ دفعات تھیں۔

دوسرے حصہ میں غیر مسلموں کے اور بالخصوص مدینے کے یہودیوں کے حقوق اور فرائض درج تھے۔

منشورِ مدینہ کی خصوصی دفعات

منشور کی ابتداء میں اس سیاسی نظام کے وجود میں آنے کا اعلان کیا گیا، جو مہاجرینِ مکہ، انصارِ مدینہ اور ان کے ان مومنین پر مشتمل تھا جنہوں نے ان کی معیت میں جہاد کیا تھا۔ یہ سیاسی جمعیت اس واضح شرط کے ساتھ وجود میں آئی کہ سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلیں گے۔ اندرونی تنوّع کے باوجود اس سیاسی جمعیت کو ایک نظام قرار دیا گیا۔ اور تمام بقیہ دنیا سے الگ اور مختلف۔ ان مسلم گروہوں کے ساتھ جو اس نظام کے اجزائے ترکیبی تھے، فرائض اور حقوق کے معاملے میں مساویانہ برتاؤ منظور کیا گیا۔ جنگ اور صلح ریاست کے مشترکہ امور قرار دیئے گئے اور ہر شخص کو جنگ اور صلح میں فریق گردانا گیا۔ فوجی خدمت ہر شخص کے لئے لازمی قرار دی گئی۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے لئے یہ حق تسلیم کیا گیا کہ وہ جس کو چاہے پناہ دے اور معمولی سے معمولی آدمی کے وعدے کی پابندی پوری جماعت پر لازم کی گئی۔ اس طرح اس نئی سیاسی جماعت میں آزادی، مساوات اور اخوت عملاً نافذ ہوئی۔

پناہ دینے کے حق کو اس شرط کے ساتھ محدود کر دیا گیا کہ قریش مکہ کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ قریش کے معاملے میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ انہوں نے چونکہ مسلمانوں پر زیادتیاں اور مظالم کئے ہیں اس لئے ان سے بدلہ لینے میں مسلمانوں کا کوئی مزاحم نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری عدالت اپیل ہوں گے یہ دفعہ بھی تھی کہ قرضوں کی ادائگی مقروض کے جدی رشتہ داروں کے ذمہ ہوگی۔ قبائل پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی گئی کہ وہ فدیہ دے کر اپنے قیدیوں کو دشمن کے ہاتھ سے آزاد کرائیں۔

انصار کے قبائل معیّن تھے اور ان کو اسی حیثیت سے تسلیم کیا گیا، لیکن مہاجرین

کو امور اجتماعی اور امور عدلیہ کے لیے ایک قبیلہ مانا گیا۔

عدلیہ کا انتظام اب قبائل میں اشخاص کا کام نہیں رہا بلکہ اب وہ پوری جماعت کا کام ہو گیا اور اس شعبے کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مرکوز تھا یہ واقعی بڑا اقدام تھا۔ اعلان کر دیا گیا کہ کامل غیر جانبداری معمول رہے گا۔ اور جانبداری کی تمام راہیں بند کر دی گئیں۔ معاشرتی امور میں تمام مسلمان اجتماعی طور پر ذمہ دار بنا دیئے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی کو ضرر پہنچائے یا دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرے۔

منشور مدینہ کا دوسرا حصہ غیر مسلموں اور خصوصاً مدینے کے یہودی قبائل کے متعلق تھا۔ یہودی بحیثیت جماعت مدینے کی ریاست میں شریک ہو گئے جسکی تشکیل وفاق کے طور پر ہوئی تھی۔

اس حصہ کی پہلی اہم دفعہ میں یہ طے کر دیا گیا کہ مسلمان اور یہودی جب کسی جنگ میں شریک ہوں گے تو وہ الگ الگ اپنے اخراجات جنگ کے کفیل ہوں گے دونوں مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی پیروی کریں گے۔ سیاسی اور ثقافتی امور میں یہودیوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق دیئے گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ یہودی دفاع کے معاملے میں مسلمانوں کے حلیف ہو گئے۔ اور ان کے ذمے یہ تھا کہ جن سے مسلمان لڑیں ان سے وہ بھی لڑیں اور جن سے مسلمان صلح کریں ان سے وہ بھی صلح کریں ــ یہودیوں کے ذمے یہ بھی تھا کہ وہ مدینے کے دفاع میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت کریں اگر مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ عمل واقع ہو تو یہودیوں پر واجب تھا کہ اپنے حلیفوں کی مدد کو آئیں۔ مگر پھر بھی دفاع مرکز کا کام تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں اور یہودیوں کی متحدہ عسکری طاقت کے سردار ہو گئے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی فتح تھی۔

داخلی جماعتی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مداخلت نہیں کی اور فدیے، خوں بہا، پناہ دینے اور وکالت کے معاملات میں آپ نے قدیم رسوم و رواج اور روایات قائم رکھیں۔ اس پالیسی سے یہودیوں کی تمام بدگمانیاں اور شبہات رفع ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کے لئے بھی آخری عدالت اپیل تسلیم کر لیا۔ صلح اور جنگ کی طرح شعبہ عدل کا بھی مرکزی شعبہ ہو گیا۔ اور اس بنا پر ہر قسم کی مداخلت ممنوع قرار دے دی گئی اور زمانہ سابق کے وہ تمام انتقام اور جوابی انتقام جو قتل سے متعلق تھے، منسوخ کر دئے گئے۔ یہودیوں کے معاملے میں یہ ہوا کہ انہوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حاکم مانا بلکہ مکہ معظمہ کو مقدس شہر بھی تسلیم کیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور سیاسی کارنامہ تھا۔

منشور کی دفعات کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدلیہ، وضع قانون، فوج اور عاملہ کے اعلیٰ ترین اختیارات اپنے لئے محفوظ کر لئے۔ جہاں تک مہاجرین اور انصار کا تعلق تھا ان کو ایسی دفعات پر کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن یہودیوں کو، جو تمدنی اعتبار سے عربوں کے مقابلے میں افضل تھے یہ وضع منظور کرنے پر رضامند کر لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی فراست کا شاہکار تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کامیابی زیادہ تر اس وجہ سے ہوئی کہ یہودی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی کردار اور مقصد میں اخلاص کو مانتے تھے۔ وہ اس کے قائل تھے کہ آپ واقعی الامین کے اس خطاب کے مستحق ہیں جو ان کی قوم نے نبوت سے بھی قبل دیا تھا اور اس حیثیت سے وہ جو کچھ کہتے ہیں وہی ان کے دل میں ہوتا ہے اور جس بات کی دوسروں کو تبلیغ فرماتے ہیں اس پر خود بھی عمل کرتے ہیں۔ دوم یہ کامیابی اس وجہ سے ہوئی کہ آپ نے جو عقائد و تصورات پیش کئے وہ بڑے افضل اور اعلیٰ تھے اور

آپ جیسے مدینے میں نافذ فرمانا چاہتے تھے - آپ نے اپنی مثال سے یہ ثابت کر دیا کہ آپ میں اور دوسرے فرمانرداؤں میں بڑا وسیع فرق ہے - آپ نے یہ ان کے دلنشین کر دیا کہ اس میں آپ کا ذرہ برابر کوئی مفاد نہیں ہے - اس کے برخلاف آپ کی سیاست میں بہت ہی بلند اخلاقی مقصدیت تھی - مزید براں یہ کہ آپ نے جو سیاسی نظام برپا کیا اس میں حاکمیت اللہ کی تھی اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نائب، جو اللہ کے قانون کو اسی طرح اپنے اوپر نافذ فرما رہے تھے جس طرح کہ دوسروں پر۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوسائٹی کو جو کوئی مرکزی حاکمیت قبول کرنے کو تیار نہ تھی، ایک قانون، ایک فرمانروا اور ایک اخلاقی ضابطے کا پابند کر دیا - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس منشور کے ذریعے غیر منظم اور غیر متحد عربوں کو عمومیت اور اہل مدینہ کو خصوصیت سے متحد کرنے میں کامیاب ہوئے - یہ منشور اس اعتبار سے ایک انقلابی اقدام تھا کہ کسی فرد کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری بجائے اس کے کہ اس کے قبیلے کے ایک فرد پر ہو وہ مشترکہ عوامی ذمہ داری بن گئی - اس سے قبائلی اختلال ختم ہو گیا اور حقیقی معنوں میں ایک ریاست پیدا ہو گئی -

ہمسایہ قبائل سے دوستی

مدینے کے دفاع و تحفظ کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ داخلی استحکام کے علاوہ ہمسایہ قبائل سے دوستی بھی ہو - لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار حربی علاقوں کا اور ان مقامات کا جو ساحلی علاقوں سے متصل ہیں دورہ فرماتے ہیں اور قبائل سے ایسے معاہدات بھی کرتے ہیں جن کی رو سے مسلمان اور یہ قبائل دفاع کے لئے باہم حلیف بن جاتے ہیں - بعض معاہدات ایسے بھی ہوئے جن میں فریق ثانی نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے دشمنوں سے دوستی نہیں کرے گا۔ بعض دوسرے قبائل ایسے بھی تھے جن کو اس شرط کا پابند نہیں کیا گیا۔ مختصر یہ کہ اس میں کسی کوشش سے دریغ نہیں کی گئی، کہ جوار مدینہ کے قبائل کی مخالفت کو کم سے کم تر کیا جائے اور ان کی دوستی زیادہ سے زیادہ حاصل کی جائے۔ ایک دوسرا اہم اصول یہ تھا کہ کوئی فرد یا کنبہ اسلام قبول کرے تو وہ لازماً ہجرت کر کے مدینے یا اس کے مضافات میں آ جائے۔ فتح مکہ تک اس پر عمل جاری رہا۔

انتظامی نظام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مملکت میں تمام دینی اور دنیوی امور کے حاکم اعلیٰ تھے۔ وہ قانون وضع فرماتے تھے۔ وہ سپہ سالار اعلیٰ تھے، وہ قاضی القضاۃ (یعنی چیف جسٹس) تھے اور پورے نظام انتظامی کے افسر اعلیٰ۔ انہوں نے معاشرتی تعلقات منضبط کیے۔ قرآن کی روشنی میں قانون شریعت وضع اور نافذ فرمایا۔ انہوں نے افواج مرتب کیں اور ان کی کمان کی۔ انہوں نے ملک حاصل کئے اور ان کا انتظام کیا۔

قرآن اس حیثیت سے کہ وحی الٰہی ہے، سب مسلمانوں کے لئے واجب التعمیل تھا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی۔ قرآن کے احکام کی تعمیل میں اور جن معاملات میں قرآن ساکت تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قطعی اور ناطق تھا۔

تاہم احکام قرآنی کے مطابق آپ اہم معاملات میں اپنے صحابہ سے بھی مشورہ فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفتر

حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور یہ نہ ہوتے تو اُبیؓ بن کعب اور زید بن ثابت وحی قلمبند کرتے تھے۔ زبیر بن عوام ان اشیاء کو ضبط تحریر میں لاتے تھے جو بطور زکوٰۃ اور صدقات وصول ہوتی تھیں۔ حذیفہ ابن الیمان اس مال گزاری کا اندراج کرتے تھے جو کھجوروں کے باغات سے ہوتی تھی اور مغیرہ بن شعبہ اور حسن بن نمیر ان معاملات کی یادداشت لکھتے تھے جو لوگوں کے درمیان ہوتے تھے۔ عبداللہ بن ارقم اور علاء ابن عقبہ قبائل اور ان کے پانی کا چٹھ رکھتے تھے اور نیز انصار کے مردوں اور عورتوں کی مردم شماری کرتے تھے زید بن ثابت وہ خطوط لکھتے تھے جو بادشاہوں اور سرداروں کو جاتے تھے۔ معیقب ابن ابی فاطمہ ریاست کی اس آمدنی کا حساب رکھتے تھے جس کو الغنائم کہتے تھے۔ حنظلہ بن ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد (سیکریٹری) خاص تھے جن کی تحویل میں آپ کی مُہر رہتی تھی۔

مدینہ پوری مملکت کا مرکز حکومت تھا اور شہر مدینہ اور اس کے جوار راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت انتظام تھے۔ عرب کئی صوبوں میں تقسیم تھا اور ہر صوبے میں ایک والی رہتا تھا۔ والی کے فرائض یہ تھے کہ امن و انتظام قائم رکھے اور اس کا اہتمام کرے کہ عدلیہ کا کام جاری رہے۔

والیوں کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ اور صدقات کی تحصیل کے لئے محصل مقرر فرماتے تھے۔ چونکہ خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم ان کی تربیت فرماتے تھے اس وجہ سے یہ ان مسائل میں ماہر کامل ہوتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاضی القضاۃ تھے اور آپ کا مستقر مدینہ تھا قاضیوں (ججوں) کا تقرر آپ ہی فرماتے تھے یا والیوں کو ہدایت کرتے تھے کہ موزوں

آدمیوں کا تقرر کریں۔ آپ ایسے لوگوں کو قاضی مقرر فرماتے جو بڑے عالم ہوتے اور دیانت و امانت میں نہایت ممتاز۔ اگرچہ قاضیوں کا تقرر شریعت کا علم اور تقویٰ اور اعلےٰ کردار کے لحاظ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے تھے مگر وہ فیصلے دینے میں بالکل آزاد و مختار ہوتے تھے۔ خود یہی واقعہ کہ قاضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی دعوے قبول، اور کھلے اجلاس میں آپ کے خلاف مقدمے کی سماعت کر سکتا تھا، اسلامی دولت میں عدلیہ کی مختاری اور آزادی کی بین دلیل ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی عدالت میں حاضری سے مستثنےٰ نہیں تھے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خلاف ٹارٹ[1] کے کئی مقدمات دائر کرنے کی اجازت دی۔ جج اس پر مامور تھے کہ پہلے احکام قرآنی کی بنا پر فیصلہ کریں، اس کے بعد احادیث نبوی کی بنا پر اور اگر یہ دونوں موجود نہ ہوں تو خود اپنی رائے سے کام لیں۔

یہی صاف ہدایات تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل کو اس وقت دیں جب آپ نے ان کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قاضیوں کو اپنی حیات طیبہ ہی میں اجتہاد کرنے کا حق دے دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے افسر مقرر کئے وہ سب بلند کردار اور بڑے دیانت دار تھے، اور ذاتی قابلیت اور ان خدمات کی بنا پر ان کا انتخاب عمل میں آیا تھا جو انہوں نے اسلام کے لئے انجام دی تھیں۔ اگر کسی شخص نے کسی عہدے پر اپنے تقرر کے لئے آپ خواہش کی تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس کو وہ عہدہ دیا جائے۔ ان عمال کو یہ اجازت نہیں تھی کہ کسی کا

[1] ضرر کی وہ نوعیت جس میں جرم واقع نہ ہو

تحفہ قبول کریں اور یہ حکم تھا کہ لوگوں کے ساتھ انکسار اور نرمی سے پیش آئیں اور خدمت کی نیت سے کام کریں، اور لوگوں کے ساتھ حاکموں کا سا برتاؤ نہ کریں۔

جن لوگوں نے تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس سے بڑے متاثر ہیں کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سول سروس (عہدہ داران شعبہ انتظام) کی تربیت اور تنظیم فرمائی وہ شعبہ انتظام کے ان عمال و حکام (سول سروس) سے بالکل مختلف تھی جو دوسری تہذیبوں اور سلطنتوں میں ہوتے تھے۔ رومی اور ایرانی شعبہ انتظام کے عمال بڑے مستبد حاکم تھے، بڑی سختی سے حکومت کرتے تھے اور ان کی حیثیت بڑی امتیازی تھی (ٹھیک ایسی ہی جیسی آجکل ہمارے زمانے میں ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سول سروس نے یہ منظر پیش کیا کہ وہ ایک انتظامی طاقت تھی بغیر سرکاری تمرد کے۔ اس میں ایسے لوگ تھے جو سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ کسی شوکت و نمائش کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ وہ عام لوگوں کی طرح رہتے اور چلتے پھرتے تھے اور کوئی امتیازی شان نہیں رکھتے تھے۔ وہ دیانت دار، عادل اور خدا ترس تھے حق پروری ان کا نصب العین تھا۔ انکسار ان کا طرز زندگی تھا، انصاف ان کی پالیسی تھی۔ وہ حقیقی معنے میں شائستہ تھے اور خادم تھے۔

مالی انتظام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن ہمہ گیر تھا۔ انہوں نے صرف لوگوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی ہی کی اصلاح نہیں فرمائی بلکہ نئی قسم کے معاشی اور مالی نظام کی بھی تنظیم کی۔ زیادہ قدیم مذاہب اور تہذیبوں کو اس نقص کی وجہ سے نقصان پہنچا کہ انہوں نے معاشی اور مالی امور کو مذہب اور اخلاق کے دائرے سے باہر سمجھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ "معاملات معاملات" ہیں ان کا مذہب سے کوئی

تعلق نہیں - لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رخ اختیار کیا وہ بالکل مختلف تھا - انہوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو تحت مذہب کر دیا اور نئی مالی تقسیمات قائم کیں جنہوں نے اسلامی اخلاقیات کے اصولوں کے مطابق لوگوں کی معاشی تنظیم میں رہنمائی کی -

ہیئت تنظیم و تفصیلات

اس عہد میں آمدنی کے پانچ ذرائع تھے :

(۱) زکواۃ اور صدقات جو مسلمان ادا کرتے تھے -

(۲) عشر جو مسلمان ادا کرتے تھے -

(۳) جزیہ - یہ غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا -

(۴) خراج - (زمینوں کا وہ محصول جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا)

(۵) فیئے (خالصہ یعنی حکومت کی زمین)

(۶) مال غنیمت (وہ مال جو جہاد میں ہاتھ آئے)

زکواۃ وہ محصول ہے جو معین قسم کی جائیداد یا مال پر عائد ہوتا ہے - یہ صرف عاقل اور بالغ مسلمانوں سے وصول کیا جاتا تھا - اور مندرجہ ذیل اشیا پر عائد ہوتا ہے -

(الف) سونا اور چاندی : ۲۰ مثقال یعنی ۱/۲ ۷ تولہ سونا اور ۲۰۰ درہم چاندی

(ب) وہ مویشی جو تجارت کے لئے ہوں -

(ج) وہ مال جو حرفت و تجارت کے لئے ہو -

(د) دفینے یعنی چھپے ہوئے خزانے جو ریاست میں کسی جگہ پائے جائیں -

مختلف جانوروں کی وہ کم از کم تعداد جس پر زکواۃ واجب ہو مختلف ہے اونٹوں کو

تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے اونٹ ہیں، ان کے بعد مویشی اور تیسرے درجہ میں چھوٹے چوپائے۔

اونٹوں کی وہ کم از کم تعداد جن پر زکواۃ واجب ہوتی ہے پانچ ہے۔ مویشیوں کی وہ کم از کم تعداد جن پر زکواۃ واجب ہوتی ہے تیس ۳۰ ہے اور بکریوں اور بھیڑوں کی کم از کم تعداد چالیس ۴۰ ہے۔

زکواۃ کی آمدنی احکام قرآنی کے مطابق تقسیم کی جاتی تھی۔ مسکینوں، ضرورتمندوں، زکواۃ صدقات وصول کرنے والوں اور انہیں تقسیم کرنے والوں پر، ان پر جن کی تالیف قلوب منظور ہوتی تھی۔ گردنیں چھڑانے پر (یعنی غلاموں اور اسیران جنگ کو آزاد کرانے کے لئے)، جن لوگوں پر اللہ کی راہ میں قرضے کا بہت بار ہو گیا ہو۔ اور مسافروں پر۔

صدقات وہ محصول تھے جو مسلمان اپنی خوشی سے حکومت کو دیتے تھے۔ انہیں سے بعض لازمی بھی تھے مثلاً صدقہ عید الفطر اور قربانی کی کھالیں یہ بیت المال میں داخل کئے جاتے تھے۔ عشر وہ ٹیکس تھا جو مسلمان زمینداروں سے پیداوار کا دس فیصدی لیا جاتا تھا اگر آبپاشی کے قدرتی وسائل مہیا ہوتے ورنہ پانچ فیصدی۔

جزیہ

جزیہ صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا اور وہ اس کے معاوضے میں کہ (اسلامی حکومت) ان کی جان و مال، مذہبی مراسم کی ادائیگی اور آزادئ ضمیر کی ضامن ہوتی تھی اور فوجی خدمت سے ان کو مستثنےٰ کر دیتی تھی۔ اسی لئے جزیہ صرف ان غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا، جو جسمانی اعتبار سے تندرست اور فوجی خدمت کے قابل ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ ہر ایسے مرد پر عائد تھا جس میں اس کی ادائیگی کی استطاعت ہوتی تھی۔ عورتیں بچے، فقیر، راہب، بوڑھے، دیوانے اور وہ جو لاعلاج مرض میں مبتلا ہوں بشرطیکہ انکے لینے کافی وسائل تصرف نہ ہوں۔

خراج

یہ زمین کی مالگزاری کا وہ ٹیکس تھا جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کیا اس وقت نہ مسلمانوں کے پاس کاشت کے لیے زمین تھی، نہ کافی مزدور، نہ دوسرے وسائل اور نہ وہ خود اس حال میں تھے کہ یہ کام کریں - مزید براں یہ کہ یہودیوں نے (اس زمانے کے دستور کے مطابق) یہ تسلیم کیا کہ مفتوحہ ممالک کی تمام زمین کے مالک مسلمان ہیں اور یہ پیش کش کی کہ بحیثیت مزارعین وہ ان زمینوں کو کاشت کریں گے اور پیداوار کا ایک حصہ حکومت کو لگان کے طور پر ادا کریں گے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست منظور کی، اور پیداوار کا نصف حصہ لگان مقرر فرما دیا -

خراج کی رقم بھی جزیے ہی کی طرح سپاہیوں کی تنخواہ اور دوسری فوجی ضروریات پر صرف کی جاتی تھی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سپاہیوں کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں تھی - طریقہ یہ تھا کہ جب (مذکورہ بالا) ٹیکس وصول ہوتے تو وہ اس حساب سے سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے کہ جن کی بیویاں ہوتی تھیں ان کو دگنا حصہ ملتا تھا -

فئے

فئے کی اصطلاح محدود معنے میں اس زمین پر عائد ہوتی تھی جو مفتوحہ ممالک میں راست حکومت کی ملکیت (یعنی خالصہ) ہو جاتی تھی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بعض زمینیں خالصہ تھیں جیسے باغ فدک وغیرہ - ان کی آمدنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور

رفاہ مسلمین کے کام میں صرف ہوتی تھی۔

غنیمت

اسلحہ، گھوڑے اور دوسری ایسی منقولہ املاک جو جنگ میں کفار سے حاصل ہوتی تھیں غنیمت شمار کی جاتی تھی۔ اس کا ۴/۵ حصہ ان سپاہیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا جو شریک جنگ ہوتے تھے۔ سوار کا حصہ پیدل سپاہی سے دگنا ہوتا تھا۔ وہ سپاہی جو جنگ میں کسی دشمن کو قتل کرتا تھا اس کو عام حصے کے علاوہ مقتول دشمن کے تمام اسلحہ ملتے تھے، یہ اس دستور کے مطابق تھا جو اسلام سے پہلے رائج تھا۔ غنیمت کا بقیہ حصہ اللہ اور رسول کا حق تھا۔ یعنی ریاست اسلامیہ کا اور احکام قرآنی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں، یتیموں، ضرورت مندوں، مسافروں اور رفاہ مسلمین پر خرچ ہوتا تھا۔ لڑنے والے کفار (مرد، عورتیں اور بچے) جو جنگ میں گرفتار ہوتے تھے۔ غنیمت میں شامل ہوتے تھے اور اس ہدایت کے ساتھ سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے کہ اپنے بچوں کی طرح ان کے ساتھ برتاؤ کریں اور ان کو وہی کھلائیں اور پہنائیں جو خود کھائیں اور پہنیں۔ ان کو اس کے مواقع مہیا کئے جاتے تھے کہ آزادی حاصل کر سکیں۔ یہاں تک کہ زکواۃ کا ایک حصہ اس مقصد کے لئے الگ کر دیا جاتا تھا۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ عشر جو مسلمانوں سے زمین کے محصول کے طور پر وصول کیا جاتا تھا اور خراج میں جو زمین ہی کے محصول کے طور پر کفار سے وصول کی جاتی تھا کچھ فرق تھا۔ لیکن اس کا بدلہ زکواۃ میں ہو جاتا تھا، جو صرف مسلمانوں ہی سے وصول کی جاتی تھی اور زیادہ بھاری محصول تھی۔ مزید براں اشد ضرورت کی حالات میں مسلمانوں پر یہ واجب تھا کہ اپنی تمام فاضل دولت حکومت کے حوالے کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ طبقہ وار جنگ کے قائل تھے اور نہ بنیادی وسائل پیداوار اداروں کی تنظیم کے اجتماعی انتظام کے۔ آپ نے افراد کو نجی جائداد حاصل کرنے کی اجازت دی تاکہ ان کا جوش عمل و کوشش فنا نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی منظور نہ فرمایا کہ تمام دولت چند افراد کے پاس جمع ہو جائے جس سے سخت ترین قسم کی سرمایہ داری مستقل طور پر مسلط ہو جاتی ہے۔

فوجی نظام

فوج۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج کے سپہ سالار اعلیٰ تھے۔ آپ نے تمام بڑے اور اہم غزوات اور مہمات میں جیسے بدر، احد، حنین اور فتح مکہ میں بنفس نفیس فوجوں کی قیادت فرمائی۔ چھوٹی مہمات فوجی سرداروں کے ماتحت بھیجی گئیں۔ اس وقت تک کوئی فوجی محکمہ وجود میں نہیں آیا تھا۔ فوجوں کی بھرتی۔ ان کے لئے اسلحہ کی فراہمی، ان کے لئے رسد کا انتظام، ان کی خبرگیری اور اس پوری فوج کی قیادت یہ سب کام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انجام دیتے تھے۔

مسلم فوج کی ابتدا بہت ہی ادنےٰ حیثیت سے ہوئی تھی۔ تمام تندرست مسلمان فوج کی فہرست میں درج تھے۔ وہ سب جوش جہاد سے سرشار تھے۔ ان سب کو یہ شوق تھا کہ دین کی ترقی اور حفاظت میں اپنی جان قربان کر دیں، شہید کہلائیں اور آخرت میں اس کا اجر پائیں۔ غازی کا خطاب حاصل کرنا ایک ادنےٰ انعام سمجھا جاتا تھا۔ ان اللہ کے سپاہیوں کا اخلاقی کردار مثالی تھا۔ وہ ہر قسم کی نفسانی حرص و ہوس اور ہر قسم کی ایسی برائیوں سے احتراز کرتے تھے جو آج کل فوجی چھاؤنیوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کو معین تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ لیکن اللہ نے اس مال غنیمت میں ان کا ایک حصہ مقرر کر دیا تھا جو اسلام کے دشمنوں سے جنگ میں ہاتھ آئے۔

یہ انتظامی تدابیر کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کو کئی لڑائیوں میں شکستیں دیں اور ان کا خطرہ رفع کر دیا۔ پھر آپ نے یہودیوں کو اس سزا میں مدینے سے نکالا کہ وہ مسلسل بدعہدیاں کرتے تھے اور انہوں نے اس معاہدے کی پابندی نہیں کی جو انہوں نے اس وقت کیا تھا جب آپ نے ان کو مشہور منشور مدینہ عنایت فرمایا تھا۔

چھٹے سال ہجری میں اسلام کو تقویت دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے وہ معاہدہ حدیبیہ کیا جس کے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ جیسی کہ متعلقہ آیات قرانی میں پیش گوئی کی گئی تھی۔ اسلام کے لئے یہ معاہدہ زحمت کے پردے میں رحمت ثابت ہوا۔ اس سے نہ صرف آپ کو یہ موقع ملا کہ آپ نے پورے عرب میں پرامن طریقے پر اسلام کی اشاعت کی بلکہ آپ اس قابل بھی ہو گئے کہ آپ نے خیبر کے یہودیوں کی شرارتوں کا خاتمہ کر دیا۔ اہل مکہ نے جب عہد شکنی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع بھی مل گیا کہ آپ نے پرامن طریقے پر مکہ فتح کر لیا۔ یہ سب کرنے کے بعد آپ پورے جزیرہ نمائے عرب کو اسلامی حکومت کے ماتحت متحد کرنے میں کامیاب ہوئے اور اس طرح آپ نے اپنی حیات طیبہ ہی میں ریاست اسلامی کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا۔

ریاست کی نوعیت اور خصوصیت

اب ہم اس ریاست کی نوعیت اور خصوصیت پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ خالص مذہبی ریاست تھی اور ان تصورات اور بنیادی اصولوں پر مبنی جو قرآن میں درج ہیں محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کے پیغمبر تھے اس لئے یہ ان کے ذمے تھا کہ احکام قرانی کے مطابق امور ریاست کا انصرام فرمائیں۔ اگرچہ وحی خود آپ ہی کے

واسطے سے نازل ہوئی تھی مگر آپ نے اس کو اپنی ذات سے منسوب کرکے اس کا کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا بلکہ جو کچھ نازل ہوتا تھا آپ لوگوں کو بتا دیتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اس طریقے پر آپ نے اللہ کی حاکمیت قائم رکھی۔ نیز یہ کہ جو وحی نازل ہوتی تھی، اس کے تنہا مفسر آپ ہی تھے مگر آپ نے اس کے عمل و نفاذ سے اپنی ذات کو کبھی مستثنٰی نہیں فرمایا۔ سب سے پہلے خود آپ ہی ان احکام کی تعمیل فرماتے تھے۔ ان ریاستوں میں جو زمانہ قدیم سے عالم وجود میں آئی تھیں اور اس ریاست میں یہ بنیادی فرق مندرجہ ذیل خصوصیات پر منتج ہوا :-

مساوات

اس ریاست کی پہلی شان یہ تھی کہ قانون کے عمل و نفاذ اور محصولات (ٹیکس) کے ابواب کے معاملہ میں ریاست کے تمام شہری جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل تھے برابر تھے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ آپ نے خود اپنے خلاف کئی مقدمات ٹارٹ کے دائرے کی اجازت دی اور اس طرح اس تصور کا خاتمہ کر دیا کہ بادشاہوں کو حق الوہیت حاصل ہے۔ صدی حاضر تک میں کے نہایت درجہ جمہوری ملک انگلستان میں بادشاہ کے حق الوہیت کے آثار موجود ہیں۔ وہاں اب تک یہ اعتقاد ہے کہ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی اسلامی تصور حکومت و ریاست میں مساوات کے معنے یہ نہیں ہیں کہ سب آدمی ہر اعتبار سے برابر ہیں۔

حکومت کے عہدوں پر تقرر میں وجہ امتیاز تقوے تھا اور شریعت کا علم اور اسلام کے لئے خدمات۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ اسلامی عقائد پر ایمان کے ساتھ سب کو برابر کے مواقع حاصل تھے اور نسل، رنگ، زبان اور ملک کا کوئی امتیاز نہ تھا۔

اُخوت

اس ریاست کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھی دوسری خصوصیت قرآن کی اس مشہور آیت کے مطابق "کل مومنٌ اخوۃٌ" اخوت تھی۔ اس آیت میں یہ دعوے کیا گیا کہ تمام مسلمان خواہ ان کی کوئی نسل ہو، کوئی رنگ ہو اور کوئی زبان ہو ایک برادری کے ارکان ہیں تمام صاحبِ ایمان وہ گورے ہوں، کالے ہوں، امیر ہوں غریب ہوں، آقا ہوں، خادم ہوں، عرب ہوں غیر عرب ہوں امور ریاست کو چلانے کے لیے ان کے حقوق اور ذمہ داریاں برابر ہیں۔

اسلامی برادری کی طاقت ایسی تھی کہ ان کے مقابلے میں خون کے رشتوں کی بھی کوئی حقیقت نہیں رہی تھی۔ غیر مسلم کا اگرچہ مسلمان سے خون کا رشتہ ہوتا تاہم ریاست کے شہری کی حیثیت سے اس کا مرتبہ مختلف ہوتا تھا۔ اسلامی اخوت اس وقت اپنے کمال کو پہنچ گئی جب رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے بعد ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کو بھائی بھائی قرار دیا اور وہ ایک چھت کے نیچے بھائیوں کی طرح رہے

آزادی

اس ریاست کی تیسری خصوصیت آزادی تھی جسے انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے اس طرح پیش کیا کہ اس کی صحیح صورت سامنے آگئی۔ آزادی کا سب سے بڑا منشور اس کلمے میں ہے جس کے ذریعے سے ہر مسلمان مرد اور عورت اپنے ایمان کا اعلان کرتا ہے اس کلمے کا یہ اعلان کہ سوائے اللہ کے اور کوئی معبود نہیں ہے اللہ کے سوا ہر اختیار کی نفی کر دیتا ہے۔ چونکہ مسلمان سے اس کا مطالبہ نہیں ہے کہ وہ سوائے اللہ کے کسی اور کی اطاعت کرے اس لئے وہ آزاد ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ

صرف ان حدود کے اندر آزاد ہے جو قانون الہٰی نے متعین کر دی ہیں۔ کوئی شخص بھی دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہیں کر سکتا۔ ہر شخص صرف اپنے حقوق کی حد کے اندر اپنے آپ کو آزاد محسوس کرے گا۔ تقریر کی آزادی اور ضمیر کی آزادی اسلامی سیاست کے دو سنگ بنیاد ہیں۔ معمولی شہری بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے اختلاف اور اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا۔ لیکن آزادی کے نام سے بے راہ روی کی اجازت نہیں تھی۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں تھا کہ لوگوں کو بہتان لگائے یا عمال حکومت کو مذاق سمجھے۔

عدل

اس ریاست کی چوتھی خصوصیت عدل تھی۔ اسلامی حکومت میں انصاف بلا طرف داری چاہیئے جس میں بڑے چھوٹے، شہزادے اور کسان، کالے اور گورے اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز نہ ہو۔ قرآن مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ عدل وانصاف اور سچی شہادت کی بنا پر مقدمات کا فیصلہ کریں۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کی پوری جماعت کو عدل کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ قران کی ایسی بہت سی آیتوں کے مطابق جو غیر جانبدارانہ انصاف کے متعلق ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے لاگ انصاف کیا ہے یا ایسے قاضی مقرر کئے جو قانون شریعت کا پورا علم رکھتے تھے خدا ترس تھے، اپنے کردار میں بے داغ اور بڑے متقی تھے۔

رواداری

ریاست کی پانچویں خصوصیت وہ رواداری تھی جو اس اہل کتاب غیر مسلم رعایا کے حق میں منظور کی گئی جو اللہ کے وجود کی قائل تھی۔ جب ایسے لوگوں نے اسلامی ریاست

میں رہنا منظور کیا تو مندرجہ ذیل مشہور آیۃ قرآنی کے مطابق ان سے تعلقات رہے "لا اکراہ فی الدین" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ذمی یعنی "حکومت کی ذمہ داری قرار دیا اور ان کے حق میں ضمیر و مذہب کی پوری آزادی اور جان، مال اور آبرو کی حفاظت منظور کی۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ آپ نے ان کے لئے اس سے بھی زیادہ کیا۔ آپ نے ان کے لئے اس کا پورا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اپنی ثقافت اور روایات کو ترقی دیں اور اپنے ذاتی امور کا اپنے مذہبی قانون کے مطابق انتظام کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسروں کو اسلامی ثقافت اور روایات قبول کرنے پر مجبور کریں۔ یا اس کے لئے جبری تدابیر اختیار کریں کہ تحت حفاظت لوگوں کی کلچر کو مسلمانوں کی کلچر میں اس طرح غرق کر کے فنا کر دیا جائے جیسے عہد حاضر کی قومی ریاستیں کرتی ہیں۔

چونکہ ذمی اس پر مجبور نہیں کئے گئے تھے کہ وہ اسلامی دولت کی حفاظت کے لئے فوجی خدمت انجام دیں اس لئے اس کے عوض ان سے ایک چھوٹا سا ٹیکس لیا جاتا تھا جسے جزیہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کے ساتھ اس قدر روادار تھے کہ جب نجران کے عیسائی جزیہ دینے پر رضامند نہ ہوئے اور اس کے لئے آمادہ کہ زکوٰۃ دگنی ادا کریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی سے اُن کی پیشکش منظور کر لی۔

غیر مسلموں کے حقوق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمیوں کے لئے جزیہ کے معاوضے میں جو شرائط منظور کی تھیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے متعلق آپ کی پالیسی کا رخ کیا تھا۔

(۱) اگر دشمن ان پر حملہ کردے گا تو مسلمان ان کی حفاظت کریں گے۔
(۲) ان پر یہ اثر نہیں ڈالا جائے گا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر دیں۔
(۳) ان سے یہ مطالبہ نہیں ہوگا کہ وہ بذات خود محصل ٹیکس کے پاس جا کر جزیہ ادا کریں۔
(۴) ان کی جانیں محفوظ ہوں گی۔
(۵) ان کا مال، دولت اور مویشی محفوظ ہوں گے۔
(۶) ان کے تجارتی کارواں محفوظ ہوں گے۔
(۷) ان کی زمینیں محفوظ ہوں گی۔
(۸) ان کی ملکیت میں جو کچھ ہوگا وہ سب محفوظ رہے گا۔
(۹) ان کے مذہبی پیشوا اپنے مناصب سے نہیں ہٹائے جائیں گے۔
(۱۰) ان کی صلیبوں اور ان کے گرجوں کو ضرر نہیں پہنچایا جائے گا۔
(۱۱) ان کی زمینوں پر فوجی جمعیت نہیں بھیجی جائے گی۔
(۱۲) ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ اپنے مذہبی عقائد ترک کریں۔
(۱۳) جو حقوق ان کو حاصل ہیں ان میں کمی نہیں کی جائے گی۔

اسلامی ریاست کا سب سے زیادہ ممتاز پہلو یہ تھا کہ اس نے غیر مسلموں کو معاشرتی اور عدالتی امور میں خود اختیاری دی۔ یہ قرآن کی اس آیۃ کی بنا پر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر غیر مسلم جماعت کو اسلامی ریاست میں عدالتی خود اختیاری عنایت فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدینے کے یہودیوں نے بیت المدارس کی۔ نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صرف باشندوں کو ان کی جان اور مال کی حفاظت ہی کی ضمانت نہیں دی بلکہ بطریقوں اور پادریوں

کے تقرر کا اختیار بھی صاف الفاظ میں عیسائی جماعت ہی کو دیا۔

مسلم روایات کا اس پر بڑی سختی سے اصرار ہے کہ اسلامی دولت کے غیر مسلموں کے ساتھ خصوصیت سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص ایسے آدمی کے ساتھ ظلم کرے گا جس کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے گا تو قیامت کے روز میں اس کے خلاف وکالت کروں گا۔

البتہ ان کافروں کے معاملہ بالکل مختلف تھا جو نہ اللہ کے وجود کے قائل تھے نہ قیامت کے یا ان کا جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے تھے اور بنی نوع انسان پر ہر قسم کے خلاف انسانیت مظالم روا رکھتے تھے۔ اللہ کے ان دشمنوں نے عرب میں لوگوں کو مستقل ذہنی غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسلامی تعلیمات کے یہ سخت خلاف تھے اور پیروان اسلام سے مسلسل برسرپیکار۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں پر ایسے سخت مظالم کئے کہ وہ اپنے گھر اور مال و دولت چھوڑ کر مدینہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔

اس پر بھی ان دشمنان خدا نے پیچھا نہ چھوڑا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کو قتل کر کے اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی انتہائی کوشش کرتے رہے۔ ان کے اس طرز عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک یہ کافرانہ مسلک باقی ہے اسلام ترقی نہیں کر سکتا۔ لہذا آپ نے شرک اور کفر کے خلاف سخت جنگ کی۔ قرآن میں چونکہ شرک کو فتنہ کہا گیا ہے جس کو دنیا سے مٹا دینا چاہیئے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک اطمینان نہ ہوا جب تک کہ جزیرۃ العرب کو آپ نے کفر اور شرک کی نجاست سے پاک نہ کر دیا۔

اعتقادی ریاست

عہد حاضر کی کسی ریاست سے اس کا موازنہ کرنا محض ایک دھوکہ ہے۔ کیونکہ اپنی حقیقت اور بنیاد کی بنا پر وہ ان سب سے مختلف تھی اور اپنی جگہ خود ریاست یا دولت کی ایک جداگانہ قسم چونکہ وہ قرآنی اصولوں پر مبنی تھی اور اس کو ایک معین مقصد پورا کرنا تھا اس لئے اس کو اعتقادی ریاست کہا جا سکتا ہے۔

اس ریاست کے معاملات چونکہ قرآن کے قوانین کے مطابق منضبط ہوئے اور امور دین اور امور دنیا دونوں کے متعلق ہیں اس لئے یہ مشکل ہے کہ دنیوی اعمال مذہبی اعمال سے الگ کئے جائیں۔ لہذا اس کو دنیوی بھی سمجھنا چاہیئے اور دینی بھی۔ لیکن اس ریاست کا پہلا مقصد اشاعت اسلام تھا جس کی حفاظت اور بقا کے لئے یہ وجود میں آئی تھی۔

اس ریاست کا امتیازی پہلو یہ تھا کہ اس میں نظام حکومت کا عملدرآمد باہمی مشورے سے ہوتا تھا۔ قرآن پیروان اسلام کے متعلق فرماتا ہے :- وَاَمرُهم شورىٰ بينهم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قرآن کے تنہا مفسر تھے، اس صاف حکم کے مطابق ان انتظامی امور میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا جن کے متعلق کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔

اس ریاست کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ تھا کہ اللہ نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک امانت قرار دیا اور رسول اللہ نے جو بدرجہ اتم امین تھے اپنے فرائض امانت کے صحیح مفہوم میں انجام دیئے۔ انہوں نے اپنے کو بادشاہ یا حاکم نہیں بلکہ متولی سمجھا جس کا کام یہ تھا کہ لوگوں کے معاملات کا اس طرح

انتظام کرے کہ اس سے لوگوں کا فائدہ ہوا۔ عملاً آپ پورے جزیرہ نمائے عرب کے فرمانروا تھے لیکن آپ نے اپنی حفاظت کے لئے کوئی گارڈ رکھنا پسند نہیں فرمایا اور نہ اپنے گھر میں کوئی پیش خدمت رکھا۔ آپ کے چاروں طرف غلاموں کا ہجوم رہتا تھا مگر آپ اپنے تمام کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے اور اس طرح اپنے عمل سے امّت کو یہ درس دیتے تھے کہ محنت میں بڑا وقار ہے۔ آپ بیت المال سے اس کے سوا ایک حبہ نہیں لیتے تھے جتنا کہ ریاست کے ایک معمولی شہری کی حیثیت سے آپ کا حق تھا۔

رعایا کے حق میں یہ ایسی نرالی عافیت پسند دولت تھی کہ انسانی فکر و عمل سے ایسی کوئی دوسری وجود میں نہیں آئی۔ آپ کی حکومت بس خدمت عامہ کا ایک کارپرداز ادارہ تھی۔ معاشرہ ایسا متحد تھا کہ اپنی خوشی سے ہر مسلمان بس اتنا صرف کرتا تھا کہ بقائے حیات کے لئے واجبی تھا۔ بقیہ دولت جماعت مسلمین کی عام ضروریات پر خرچ ہوتی تھی۔ سر دولت ہونے کی بنا پر آپ نے اپنے کو زکواۃ و صدقات سے مستثنیٰ نہیں کیا اور آپ ایسی سادگی اور کفایت شعاری سے بسر کرتے تھے جس طرح آپ چاہتے کہ آپ کے پیرو کریں۔

مقاصد دولت

اس ریاست کے مقاصد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائی قرآنی الفاظ[1] میں یہ تھے۔ آیۂ قرآنی:- **کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔**

قرآن نے مسلمانوں کے متعلق[1] یہ بھی کہا ہے کہ وہ بہترین امت ہیں اور اس لئے بروئے کار لائے گئے ہیں کہ نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں۔ یہ آیتیں

---

[1]

بڑی پر مبنی ہیں اور مسلمانوں کے فرائض کے متعلق ان میں اسلامی دولت کے مقاصد کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ آیتہ کے پہلے حصہ میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر ہے جس سے مسلمان واقعی زندگی میں اخوت، مساوات آزادی اور انصاف کے اصول برتنے اور سر دولت کی اطاعت کرنے کی قابل ہو جاتے ہیں۔ دوسری آیتہ کے پہلے حصہ میں مسلمانوں کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے اور ایسی جو ظلم اور برائی کر ہی نہیں سکتی۔ اس لئے ان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کرنے کی نصیحت کریں اور برائی سے روکیں۔

قرآن کے ان واضح احکام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عظیم ذمہ داریاں عائد کر دیں اور آپ کو اس پر مجبور کیا کہ غیر ممالک کے طاقتور فرمانرواں کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ لیکن ان مطلق العنان بادشاہوں نے ضمیر کی آزادی بھی گوارا نہ کی اور اپنی حدود حکومت کے اندر اسلام کی تبلیغ منظور نہیں کی صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی اور یہ دھمکی دی کہ ان کو اس کے سخت نتائج برداشت کرنے پڑیں گے۔ ان میں سے بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفراء کو قتل تک کرا دیا۔ تبلیغ اسلام کی راہ میں ان موانع کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں قریش کے خلاف اور عرب کے باہر غیر ممالک کے فرمانرواؤں کے خلاف سخت جنگیں کرنی پڑیں۔ اس طرح سے یہ چھوٹی سی اسلامی ریاست ظلم شر اور اللہ سے انکار کی مخالف طاقتوں کے خلاف جو اس وقت دنیا پر مسلط تھیں؛ مستقل طور پر برسرپیکار رہی۔ بنی نوع انسان کو جسمانی اور ذہنی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے تھا کہ برائی کی تمام طاقتوں کے خلاف جہاد کریں۔ یہ جہاد ذاتی مرتبے طاقت اور دولت میں مزید اضافے یا قومی شوکت میں ترقی کے لئے نہیں بلکہ اللہ کی حکومت قائم کرنے اور آدمی پر آدمی کے

ظلم اور آدمی کی آدمی کے ساتھ ناانصافی اور خلاف انسانیت عمل کے انسداد کے لئے کئے گئے تھے۔

یہ مقاصد تھے جنہیں حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحکم تنصیبات کی بنیادوں پر یہ دولت قائم کرنی ضروری سمجھی تاکہ آپ کے پیرو آپ کا مشن جاری رکھیں اور اس طرح آزادی اور انصاف کی مشعل روشن رہے۔ اگلے باب میں معلوم ہوگا کہ آپ کے اصحاب خاص، خلفائے راشدین کس طرح آپ کے قدم بقدم چلے اور ان تنصیبات کو جو ان کے آقا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھیں کس حد تک ترقی دے سکے۔

باب ۳

اسلامی تنصیبات عہد خلفائے راشدین میں

اسلام اجتماعی ثقافتی تحریک ہے اور اس کی ابتدائی تاریخ سے اس حقیقت کی شہادت ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چند عقائد اور اعمال ہی کی تبلیغ نہیں کی بلکہ آپ کے زمانے میں جتنے اجتماعی اور سیاسی مسائل تھے آپ نے ان سب کو حل کرنے کی کوشش کی اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ہدایت ربانی پر عمل کیا۔ وہ انقلاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا، ہمہ گیر تھا۔ وہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھا اور اسنے اس کو کلی طور پر بدل دیا۔

اسلامی تحریک کا ایک نہایت معنے خیز پہلو یہ ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو ایک نیا تصوریہ یا فکریہ دے دیا اور اس نے اس کے لئے ایسی تنصیبات بھی قائم کردیں جن سے اس تصوریے کے بسہولت عمل درآمد کی ضمانت بھی ہو جائے۔

انسانی تاریخ میں افراد بڑے اہم اور ان کے کام عہد آفریں رہے ہیں۔ لیکن مستقل انقلاب صرف وہ ہو سکتا ہے جو معاشرے کے رسوم و رواج، قوانین، معمولات اور تنظیمات یعنی انسٹی ٹیوشنز کو بدل دے اور اس کو نئے ایسے رسوم و رواج، قوانین، معمولات دے دے جن سے معاشرے کی ترقی صحیح روش پر یقینی ہو جائے۔ قوانین، معمولات اور تنظیمات تصورات کا لنگر ہوتی ہیں جن سے وہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے اور وہ اس کو معاشرے میں استحکام کے ساتھ جاگزیں کر دیتی ہیں۔ کیونکہ افراد کی زندگیاں محدود ہیں مگر انسٹی ٹیوشنوں کی نہیں۔ افراد مر جاتے ہیں اور وہ زندہ رہتی ہیں، اور ان مقاصد و تصورات کی تکمیل کے لئے کام کرتی رہتی ہیں جن کے لئے افراد زندہ رہتے ہیں اور مرتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں انسٹی ٹیوشنوں کی اہمیت یہ ہے۔

اسلامی تاریخ کے گہرے مطالعے سے یہ ایک نرالی حقیقت سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایسے نئے آدمی ہی پیدا نہیں کئے جو جوش اسلام سے سرشار تھے بلکہ ایک نیا معاشرہ ان نیا نظام برپا کر دیا جو آپ کی تعلیمات سے صورت پذیر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا المناک حادثہ وفات تحریک اسلامی پر بڑی سخت پڑی تھی مگر آپ نے جو تنظیمات قائم فرما دی تھیں انہوں نے معاشرے کو اس قابل کر دیا کہ وہ ان تمام طاقتوں پر غالب آیا جو تشتت و افتراق کا باعث تھیں اور اس نے مقصد کی طرف ترقی جاری رکھی۔ عرب کی اسلامی سوسائٹی اس ضرب کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لگی تھی صرف ان تنظیمات ہی کے ذریعے سہار سکی جو آپ نے قائم فرما دی تھیں۔ وہ تنظیمات جنہوں نے تشتت افتراق کو روک دیا۔ یہ تنظیمات مستحکم رہیں اور ان کو آپ کے صحابہ نے مزید ترقی دی جن میں چار خلفائے راشدین خاص تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے دلوں میں تنظیمات کا جو

خیال پیدا کو دیا تھا وہ کس قدر راسخ تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ خلافت جو مرکزی یعنی اہم ترین تنصیب تھی، آپ کی وفات کے بعد اسی کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی اور امت اسلامیہ سے سرکار کا انتخاب جو اس کے اتحاد اور اس کی تنظیم کی نمود تھا آپ کی مراسم تدفین سے بھی قبل عمل میں آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرکز میں صاحب اختیار کوئی نہیں رہا تھا اس لئے ان مسلمانوں نے جن کو اس تنصیب کا بڑا خیال تھا انہوں نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ ایک دن بھی یہ بغیر لیڈر اور بغیر مرکزی ادارے کے گزرے۔

بنیادی اسلامی تنصیبات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرما دی تھیں لیکن آپ کے عہد حکومت میں دولت اسلامیہ عرب تک محدود تھی۔ بعد میں اس کی وسعت دور و دراز ملکوں تک پہنچی اور نئے پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے اس لئے تاریخ کے طالب علم کو یہ معلوم کرنے کا شوق ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں کیا ترقیاں ہوئیں اور اس دوران میں اسلامی تنصیبات کی ترقی نے کیا صورت اختیار کی۔ ہم صفحات ذیل میں اس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ خلفائے راشدین کے عہد میں تنصیبات کو کیا ترقی ہوئی۔ سب سے پہلے ہم سیاسی ہی تنصیبات کو لیتے ہیں[1]

سیاسی تنصیب

خلافت

پہلی تنصیب جس نے اس عہد میں ترقی کی وہ خلافت تھی۔

---

[1] صفحات ذیل میں ہم نے صرف بڑی سیاسی انسٹی ٹیوشنوں کا ذکر کیا ہے (بقیہ حاشیہ صلا پر)

خلافت کے عام مسئلے پر قرآن کے احکام بالکل قطعی ہیں - آدمی اللہ کا نائب (خلیفہ) ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات کے مطابق اپنے معاملات کا انصرام کرے۔ لہذا مسلمان یہ جانتے تھے کہ اپنی جماعت اور دولت کی تنظیم کس طرح کریں اور کس طرح اس مشن کو جاری رکھیں جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سعی فرماتے رہے - اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سمت میں رہنمائی فرمائی لیکن آپ کی جانشینی کا نہایت اہم مسئلہ اس حالت میں رہا کہ وہ طے نہ ہوا تھا -

لہذا عام طور پر تمام مسلمانوں کے اور خصوصیت سے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ نہایت پیچیدہ مسئلہ تھا کہ آپ کا جانشین کون ہوتا جانشین پیغمبری میں نہیں، رسالت اور نبوت آپ کی ذات پر ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی تھی، بلکہ آپ کے خلیفہ کی حیثیت سے جانشین جس کو بجائے آپ کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے امور انجام دینے تھے - مذہبی رہنما کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں امامت فرماتے تھے اور دنیوی امور میں رہنما کی حیثیت سے آپ پورے عرب کے فرمانروا تھے - چونکہ مذہبی امور دنیوی امور سے الگ نہیں کئے جا سکتے تھے اس لئے یہ ضرورت درپیش تھی کہ کوئی ایسا شخص ہو جو دونوں کام بحسن وخوبی انجام دے سکے -

یہ ظاہر تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہی میں سے کوئی ہونا چاہیے جو اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہو - کیونکہ یہ حضرات اسلام کے ثمر ہائے

خلفائے راشدین کے عہد میں دولت اسلامیہ کی ترقی اور ارتقاء پر مفصل بحث مصنف کی اس کتاب میں ملے گی جس کا نام ہے - اسلامک اسٹیٹ : اے ہسٹاریکل سروے -
Islamic State : A Historical Survey

اولین تھے اور اسلامی معتقدین کے لئے انہوں نے مصائب برداشت کی تھیں اور
اس کے لئے آمادہ تھے کہ خواہ جان اور مال سب قربان کرنا پڑے اسلامی ریاست
کو قائم رکھیں گے اور چلائیں گے۔ اس کے علاوہ وہی اس کے سب سے زیادہ
اہل تھے کہ اس کام کی تکمیل کریں جو ان کے آقا اور مولا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے شروع کیا تھا۔

اس لئے خاص اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی روایات
اور اسلامی اسپرٹ کے مطابق جانشینی کے لئے یہ تین طریقے اختیار کئے جو مسلمانوں
کے لئے نظیر کا کام دے سکتے ہیں اور وہ اپنے حالات کے اعتبار سے کسی ایک کی
پیروی کر سکتے ہیں۔

اور امت کے عمائد کی رائے سے انتخاب اور عام جماعت مسلمین کی بیعت جیسا کہ
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے معاملے میں ہوا۔ مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر
بحث کے بعد حضرت عمر فاروق رضؓ نے اقرار و اعلان کیا کہ ابوبکرؓ چونکہ سب سے زیادہ
محترم اور خاص اصحاب رسول اللہ علیہ وسلم ہیں، سب سے بڑے ہیں اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کے دوران میں خود آپ ہی کے حکم سے (مسجد نبوی
میں) ان کو نماز میں امامت کرنے کی عزت حاصل ہوئی ہے ؛ وہ حضرت ابوبکر رضؓ
کو خلیفہ رسول مان کر ان کی اطاعت کریں گے اور انہوں نے حضرت ابوبکر رضؓ
کے ہاتھ پر بیعت کی۔

۲۔ (عمائد امت سے مشورے کے بعد) خلیفہ وقت کا اپنے آخری ایام میں کسی
کو نامزد کرنا اور جماعت مسلمین کی طرف سے بیعت: اپنی آخری علالت کے دوران
میں حضرت ابوبکر رضؓ کو یہ خیال ہوا کہ اپنی جانشینی کے لئے کسی کو نامزد کریں، اور
خوب غور کرنے کے بعد انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابہ کے

سامنے حضرت عمرؓ کا نام پیش کیا اور جب سب نے آپ کی تجویز سے اتفاق کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ حضرت عمرؓ کو نامزد کریں۔ اس کے بعد انہوں نے عام مسلمانوں کا اجتماع کیا اور اس میں اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ جس وقت حضرت ابوبکرؓ نے اپنی جانشینی کے لئے حضرت عمرؓ کے نام کا اعلان کیا تو سب لوگوں نے بڑے جوش اور نعروں کے ساتھ اسے منظور کیا اور لوگوں نے اس طرح عہد وفاداری دیا (یا بیعت کی) کہ کسی طرف سے نامنظوری کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی۔

۳۔ سابق خلیفہ کی طرف سے ایک مجلس کا تقرر جس کو یہ اختیار تھا کہ خلیفہ کا قطعی انتخاب کر دے۔ جب خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروقؓ کو ایک عیسائی نے سخت زخمی کر دیا اور آپ کی زندگی کی کوئی توقع نہ رہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے اصحاب ان کی جانشینی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آئے پہلے تو حضرت عمرؓ اسی کے لئے تیار نہیں تھے کہ کسی کو نامزد کریں اور پھر انہوں نے یہ فرمایا کہ اگر ابوعبیدہ زندہ ہوتے یا ان کا آزاد کردہ غلام سلیم تو بس ان دونوں میں سے کسی کو نامزد کرتا۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ خود اپنے بیٹے کو نامزد کر دیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تو میرے تصور میں بھی نہیں آیا تھا کہ اپنے بیٹے کو عہدہ خلافت کے لئے نامزد کر دوں۔ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزید اصرار پر حضرت عمرؓ نے اجل صحابہ میں سے چھ کی ایک مجلس قائم فرما دی اور ان کو یہ ہدایت کی کہ آئندہ تین روز کے اندر اپنے درمیان سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ انہوں نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا نام بھی ان ارکان کونسل کے ساتھ شریک فرما دیا، مگر اس صاف شرط کے ساتھ کہ اگر کسی انتخاب میں دونوں طرف رائیں برابر برابر ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس میں کاسٹنگ ووٹ ڈالیں گے لیکن وہ خود خلیفہ منتخب نہیں ہو سکیں گے۔

ان ہدایات کے مطابق کونسل نے حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ کے بعد فوراً کام شروع کیا۔ انتخاب میں سہولت پیدا کرنے کے لئے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے یہ تجویز پیش کی کہ کونسل کے بعض ارکان خلافت کی امیدواری سے اپنے نام واپس لے لیں۔ اس پر سعد بن وقاصؓ، زبیرؓ اور طلحہؓ کے نام واپس لئے گئے اور انتخاب کے لئے صرف تین نام رہ گئے یعنی حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ کے۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ اب جو شخص خلافت کے انتخاب سے اپنا نام واپس لے گا اس کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ بقیہ دو امیدواروں میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر دے۔ یہ سننے کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں خاموش رہے۔ اس پر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اپنا نام واپس لے لیا اور یہ ذمہ داری لے لی کہ خلیفہ کا آخری انتخاب وہ خود کریں جتنا وقت باقی رہ گیا تھا وہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے لوگوں کی رائے معلوم کرنے میں صرف کیا اور جب ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اکثریت حضرت عثمانؓ کی تائید میں ہے تو انہوں نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا فیصلہ سب لوگوں نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ اس میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے اور دنیائے اسلام کے سب لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں بیعت کی۔

خلافت کے اس ابتدائی دور میں خلیفہ کی جانشینی کے لئے جو مذکورہ بالا طریقے اختیار کئے گئے ان سے اس کے متعلق کہ اسلامی ریاست میں سیاسی حاکمیت کہاں واقع ہے مندرجہ ذیل بنیادی اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) اسلامی ریاست میں اختیار حاکمیت ناقابل تقسیم ہے۔ جماعت مسلمین کے مسائل کا ذمہ دار صرف ایک خلیفہ ہو سکتا ہے۔

(۲) سرِ دولت اسلامیہ کے تقرر کے لئے انتخاب ضروری ہے۔ خلفائے راشدین نے وراثت کی بنا پر جانشینی۔۔ بڑی احتیاط کے ساتھ احتراز کیا۔

(۳) صرف بڑے درجے کے اصحاب رسول صلعم عہدہ خلافت کے لئے کھڑے ہو سکتے تھے اور مدینہ کے بقیہ لوگ انتخاب کر سکتے تھے۔ ان کے بعد جو لوگ رہے ان کا کام یہ تھا کہ اگر وہ مدینہ میں ہوں تو راست منتخب خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کریں اور جو صوبوں میں ہوں وہ اس کے نمائندوں کے ہاتھ پر۔

اسی بنا پر یہ ہوا کہ ماوردی نے ان لوگوں کے لئے جو عہدہ خلافت کے اہل ہو سکتے ہیں مندرجہ ذیل فضائل تجویز کئے:

۱۔ امانت و دیانت میں بے داغ ہو۔
۲۔ فقہ اسلامی کا ضروری علم رکھتا ہو۔
۳۔ سماعت، بصارت اور گفتار میں کوئی نقص نہ ہو۔
۴۔ جسمانی نقائص و کمزوریوں سے آزاد ہو۔
۵۔ حکومت اور امور دولت و ریاست میں صاحب بصیرت ہو۔
۶۔ اسلامی دولت کی حفاظت اور دشمنوں سے جنگ کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔
۷۔ باعتبار نسب قریش کے قبیلے سے ہو۔

عہدۂ خلافت کی شرائط میں سے ماوردی نے دو باتیں نظر انداز کر دی تھیں بعد کے فقیہوں نے اضافہ کیں (مثلاً قاضی بیضاوی نے تاویل الانوار میں اور امام غزالی نے احیاء العلوم کی جلد اوّل کے صفحہ ۱۴۷ میں) یعنی یہ کہ وہ پورا جوان یا بالغ ہو اور مرد ہو۔

اس اعتقادی دولت کے کاروبار کو اسلام کی منشا کے مطابق چلانے کے لئے ان تمام اوصاف کی ضرورت ہے۔ ماوردی نے جو آخری شرط بیان کی ہے

کہ وہ نسباً قبیلہ قریش سے ہو، اسلامی بنیادی اصول مساوات کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اس سے واقف ہیں کہ اس زمانے میں عرب کے سیاسی حالات کیا تھے اس سے اتفاق کریں گے کہ اپنے خاندانی اثرات، سیاسی حیثیت اور کثیر تعداد میں صاحب صلاحیت اشخاص کی وجہ سے جو قریش میں قبل از اسلام اور بعد از ظہور اسلام پیدا ہوئے، صرف قبیلہ قریش ہی ایک ایسا تھا جس کی تمام عرب قبائل اطاعت کر سکتے تھے۔

اگرچہ مذکورہ بالا شرائط میں عہدۂ خلافت کے لئے غیر مسلم کے انتخاب کی ممانعت نہیں کی گئی لیکن قران کی اس مشہور آیۃ[۱] کے مطابق کہ اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو اس کے رسول کی اور ان صاحبان امر کی جو تم میں سے ہوں، یہ بالکل ظاہر ہے کہ سر دولت صرف ان ہی مسلمانوں میں سے ہونا چاہیئے جن میں مذکورہ بالا صفات ہوں۔ بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی ہے لیکن اگر اس کو باریکی سے دیکھا جائے تو یہ ناگزیر ہے۔ چونکہ اسلامی ریاست اسلامی عقائد و تصورات پر مبنی ہے اس لئے صرف انہی لوگوں کو یہ خدمت تفویض کی جا سکتی ہے جن کا ان پر اعتقاد ہو اور ان مقاصد کی ترقی کے لئے مصائب اور سختیاں برداشت کر سکتے ہوں۔

اس دور میں بھی ایک ایسی ہی اعتقادی ریاست موجود ہے یعنی کیمونسٹ اسٹیٹ، جہاں سوائے کیمونسٹ کے اور کسی کو حکومت کا انتظام نہیں دیا جا سکتا اور صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کی جمہوری حکومتوں میں سر دولت صرف انہی لوگوں کو بنایا جا سکتا ہے جن میں بعض معینہ صفات ہوں۔ انگلستان میں یہ لازمی ہے کہ سر دولت صرف پروٹسٹنٹ فرقے کا ہو۔ آئرلینڈ میں سر دولت کیتھولک

---

[۱] اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم پ۵ رکوع ۵

ہونا ضروری ہے۔ ایسی ہی شرائط ندرلینڈ، ڈنمارک اور یونان کے دساتیر میں بھی درج ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ تک میں یہ شرط ہے کہ وہ شہری جو امریکہ میں پیدا نہ ہوا ہو (یعنی بحصول حق توطن امریکہ کا شہری بن گیا ہو) عہدۂ صدارت کے لئے اس وقت تک منتخب نہیں ہو سکتا جبتک کہ اسکو امریکی قومیت حاصل کئے ہوئے بیس برس نہ گذر گئے ہوں۔

بیعت کی انسٹی ٹیوشن

خلیفہ کے انتخاب کے بعد ہر بالغ مسلمان پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ بیعت کرے (یعنی حلف لے کہ وہ اس کی اطاعت کرے گا) اس کی ضرورت دو وجوہ سے پیدا ہوئی۔ ایک اس سے کہ انتخاب کے وقت سب لوگ رائے نہیں دیتے تھے، اور دوم اس لئے کہ تمام شہری حلف اطاعت کے ذریعے پابند ہو جائیں ، ہمیشہ اس کے احکام کے پابند رہیں اور معاملات ریاست میں اس کے ساتھ تعاون کریں۔ ایک مرتبہ جب مسلمان بیعت کر لیتے تھے تو پھر وہ اس سے باہر نہیں ہو سکتے تھے تاوقتیکہ خلیفہ برملا قوانین شریعت کی خلاف ورزی نہ کرتا۔ یہ بیعت خلیفہ اور شہریوں کے درمیان بالکل ایک معاہدہ سا ہوتا تھا۔ لوگ اپنے تمام حقوق خلیفہ کی حوالگی میں دے دیتے تھے تاکہ خلیفہ قوانین الہیہ کے مطابق انکے معاملات کا انصرام کرے۔ لیکن اگر وہ انکے خلاف عمل کرتا تو وہ معاہدہ باقی نہیں رہتا اور شہری اپنے حلف اطاعت سے رہا ہو جاتے۔ چونکہ واقعی خلیفہ کا انتخاب کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ ہوتے تھے اس وجہ سے انہی کی بیعت کی اہمیت زیادہ ہوتی تھی۔ کسی ریاست نے فرد کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی کہ اسلامی ریاست نے۔ دور حاضر تک میں ہر

فرد سے سر دولت کی اطاعت کے لئے حلف نہیں لیا جاتا صرف وزراء سے دولت سے حلف وفاداری لیا جاتا ہے۔ لیکن دولت اسلامیہ میں ہر فرد کو خلیفہ کی اطاعت کا حلف دینا پڑتا ہے۔

بیعت کے ذریعے سے خلیفہ کے انتخاب میں ہر بالغ مسلمان کو جو دخل ہے اس سے عام مسلمانوں کو یہ حق بھی مل گیا کہ اگر خلیفہ احکام شریعت کے خلاف عمل کرے یا انتظام حکومت کے قابل نہ رہے تو وہ اس کے عزل کا مطالبہ کریں انتخاب کی طرح اس معاملے میں بھی پیش قدمی کرنا جلیل القدر صحابہ ہی کا کام تھا اور بقیہ آبادی کا کام اس کی تصدیق و توثیق کرنا۔ اس کے بعد خلیفہ کا عزل قطعی ہوتا تھا۔ کیونکہ خلیفہ کے لئے میعاد خدمت معین نہیں تھی۔ بس جب تک اس کا طرز عمل اچھا رہے اسی وقت تک اس کو امور ریاست انجام دینے کی اجازت تھی۔

خلیفہ کے ذاتی اخراجات

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے انتخاب کے بعد جب آپ کو اپنا ذاتی کاروبار جاری رکھنے کی اجازت نہ ملی، کیونکہ آپ کو دولت اسلامیہ کا پورے وقت کا ملازم سمجھا گیا تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ خلیفہ کو اس کی گزر بسر کے لئے کوئی وظیفہ ملنا چاہیئے۔ اس کو حل کرنے کے لئے مجلس شوریٰ کا جلسہ منعقد ہوا اور یہ طے ہوا کہ خلیفہ کو اتنا وظیفہ دیا جائے جو اس کی اور اس کے کنبے کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ جس کے تعین میں اوسط درجے کے عرب خاندان کے معیار زندگی کا لحاظ رکھا جائے۔ اس معینہ وظیفے کے علاوہ بیت المال سے خلیفہ کچھ اور لینے کا مستحق نہیں تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ چونکہ

خلیفہ بیت المال کا امین ہے اس لئے اس کو اسی طرح اس میں سے تھوڑا سا لینا چاہیئے جس طرح کہ ولی کو یتیم کی املاک میں سے۔ مگر جب بعد میں حضرت عمرؓ نے تمام مسلمانوں کے وظیفے مقرر فرما دیئے جن میں خلیفہ بھی شامل تھا تو خلفاء بھی اسی وظیفے سے اپنے اخراجات پورے کرنے لگے۔

نشانِ حاکمیت

خلیفہ کے معنےٰ ہیں نائب رسول تمام معاملات میں باستثنائے وحی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔ فطرتاً خلیفہ کا مقام بہت بلند اور باعزت تھا اور مسلمان اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ اسکا خصوصی امتیاز تھا کہ وہ نماز جماعت کی امامت اور جمعے اور عیدین کی نمازیں خطبہ دے۔ خلفائے راشدین مسجد نبوی میں روزانہ پانچوں وقت نماز جماعت کی امامت فرماتے تھے۔

صوبوں میں خلیفہ کی طرف سے والی تمام اہم فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ معمول تھا کہ خلیفہ کی عدم موجودگی میں والی اللہ اور رسول کے ذکر کے بعد خطبے میں خلیفہ کا نام لیتے تھے۔ اس طرح بعد کو تاریخ میں اس کی بڑی اہمیت ہو گئی کہ خطبے میں خلیفہ کا نام لیا جائے اور یہ خلیفہ کی حاکمیت کا بہت بڑا نشان سمجھا جانے لگا۔ نائب رسول کی حیثیت سے خلیفہ کے پاس آپ کی ایک انگشتری بھی رہتی تھی جو تمام سرکاری کاغذات پر بطور مُہر استعمال کی جاتی تھی اور آپ کی چادر بھی جسے وہ خاص مواقع پر اوڑھتا تھا۔ ان کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا بھی خلیفہ کی تحویل میں رہتا تھا۔ یہ سب چیزیں خلیفہ کے امتیازات تھے اور بعد میں نشان حاکمیت قرار پائے۔

شورےٰ کی تنصیب

قرآن کی اس آیتہ کے مطابق " وشاورھم فی الامر " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے حکم دیا کہ حکومت کے معاملے میں مشورہ کریں اور ایک دوسری آیت ہے جس میں مسلمانوں کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ وہ " جن کے کام شورےٰ سے انجام پاتے ہیں[1] " خلیفہ کو مجلس شورےٰ مقرر کرنی پڑی جس کے ارکان وہ لوگ تھے جو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑے صاحب امتیاز تھے، اور ان کے سپرد خلیفہ نے حکومت کے شعبے کئے۔ اس وقت اسلام کی پوری جمعیت سیاسیہ دو گروہوں میں منقسم تھی جن میں ایک مہاجرین تھے اور دوسرے انصار یہ لوگوں کے رہنما تھے۔ تمام عرب ان کو اپنا نمائندہ سمجھتا تھا۔ اس لئے مجلس شورےٰ کے ارکان انہی میں سے لئے گئے۔ ان کا تقرر سوائے ان کی صلاحیت کے اور کسی وجہ سے عمل میں نہیں آیا۔ دین کا علم، اسلام کے لئے ان کی خدمات اور ان کا کردار صرف یہ باتیں تھیں جو ملحوظ رکھی گئیں۔ مجلس شورےٰ کی رکنیت کے لئے تقرر میں عرب اور غیر عرب یا کالے اور گورے کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔

مجلس شورےٰ کے ارکان کی اہمیت میں اس سے کوئی کمی متصور نہیں ہونی چاہیئے کہ ان کا تقرر خود خلیفہ نے کیا اور اس وجہ سے وہ اس کے دست نگر اور تابع رضا ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ارکان مجلس شورےٰ خود خلیفہ سے زیادہ اہم تھے کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جو خلیفہ کے انتخاب اور عزل کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ اپنی حیثیت میں خلیفہ سے زیادہ مستقل تھے۔ چونکہ یہ پارٹی کی بنیاد پر نہیں بلکہ ذاتی

---

[1] وامرھم شوریٰ بینھم

اوصاف کی بنا پر چنے گئے اس لئے خلیفہ کی تبدیلی کے بعد یہ اپنی جگہ برقرار رہتے تھے تمام انتظامی مسائل اس مجلس شوریٰ کے سامنے پیش ہوتے تھے ان پر خوب بحث ہوتی اور کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا تھا۔ آخری فیصلہ چونکہ قرآن اور حدیث پر منحصر تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ مجلس کے ہر رکن کو ان دو بنیادوں پر قائل کر دیا جائے عموماً فیصلے متفقہ ہوتے تھے اور مجلس کو اجتماعی ذمہ داری کا خیال تھا۔ مجلس شوریٰ کا جلسہ خلیفہ مسجد نبوی میں طلب کرتا تھا اور اذان کے ذریعے سے اس کا اچھی طرح اعلان ہوتا تھا۔ اگر کسی بہت ہی اہم عوامی مسئلے کا فیصلہ مدنظر ہوتا تو صوبوں سے بھی نمائندے طلب کئے جاتے تھے، اور حج کے موقعے پر عام لوگوں کی رائے بھی لی جاتی تھی۔

خلیفہ کے فرائض

خلیفہ کے فرائض عہد حاضر کے تین عنوانات کے تحت بیان کئے جا سکتے ہیں۔ قانون وضع کرنا، عدل کرنا اور قوانین و احکام کا نفاذ کرنا اور تعمیل کرنی۔

قانون وضع کرنے کی انسٹی ٹیوشن

خلیفہ، کلیت پسند حکومتوں کی طرح، سرچشمۂ قانون نہیں تھا۔ وہ صرف قانون الہٰی کا نفاذ و تعمیل کرنے والا تھا۔ قانون کے سرچشمے تین تھے۔ (۱) قرآن (۲) حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اجماع (ارکان مجلس شوریٰ کی متفقہ رائے)۔

اس عہد میں چونکہ خلفاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب خاص تھے اور قرآن اور اس کے معنی دوسروں سے زیادہ سمجھتے تھے اس لئے ان کو

یہ اختیار دیا گیا کہ مجلس شوریٰ کے مشورے سے قانون وضع کریں۔

چونکہ قانون الٰہی کی اساسیات سے واضعان قانون کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ اپنے کو نہ قانون سے بالاقرار دے سکے اور نہ وہ ایسے قوانین بنا سکے جو لوگوں کے کسی خاص طبقے کے لیے مفید ہونے یا بعض حالات میں ان کا نفاذ ٹالا جا سکتا۔ اس لئے اس وقت ٹیکس اور شہری حقوق کے معاملے میں از روئے قانون سب برابر تھے۔ نیز اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان اخوت بڑھی، ضمیر کی آزادی اور اجتماعی انصاف قائم ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری پیدا ہوئی۔

عدلیہ کی تنصیب

اسلام میں عدلیہ کی خصوصیت اس کی عاملہ سے علیحدگی رہی۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد تک خلیفہ بذات خود اور اس کے افسران انتظام، قاضی کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ابتدا میں یہ ضروری تھا کہ جب تک حکومت استحکام کے ساتھ قائم ہو اور اس کا انتظامی نظام کافی حد تک ترقی کر چکے، ہر شعبے کو حکومت کے وقار اور اختیار و اقتدار کی مدد حاصل رہے۔ اس لئے ایسے حالات میں وہ شخص جس کا اختیار اس سے زیادہ نہ ہو کہ مقدمات کے فیصلے کئے جائیں، اپنے عدلیہ کے فرائض بھی اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اسی خیال سے حضرت ابوموسےٰ اشعری کو یہ لکھا کہ کوئی ایسا شخص جس کو عوام کا احترام حاصل نہ ہو قاضی مقرر نہیں کیا جا سکتا لیکن جب انتظام حکومت اچھی طرح قائم ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے عدلیہ کو دوسرے محکموں سے بالکل الگ کر دیا۔ عدالتیں قائم کیں۔ قاضی مقرر کئے اور عدالتوں کے

قواعد و ضوابط معین کیے۔

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضؓ نے تمام دولت اسلامیہ میں مجلس شوریٰ کے مشورے سے قاضی مقرر کیے تاکہ اچھی طرح عدل قائم رہے۔

کوئی ایسا شخص قاضی مقرر نہیں ہو سکتا تھا جس کو قانون شریعت پر اچھا عبور نہ ہو۔ یعنی قاضی کے لیے یہ ضروری تھا کہ قرآن کے اصولوں، حدیث نبوی اور صحابہ کرام کی نظائر کا اس کو بہت اچھا علم ہو، وہ بالغ ہو، مرد ہو، تمام دماغی صلاحیتیں اس میں پوری ہوں، وہ آزاد شہری ہو، مذہب میں مسلمان ہو۔ اس کا چال چلن بے عیب ہو اور اچھی طرح سنتا ہو، اور اچھی طرح دیکھتا ہو قاضیوں کے انتخاب میں ایسی احتیاط اور بصیرت سے کام لیا جاتا تھا کہ عرب میں جتنے قاضی تھے وہ سب بڑے ممتاز لوگ تھے۔ بعض اوقات خلیفۃ المسلمین خود عہدہ قضا کے امیدواروں کا بڑا سخت امتحان لیتے تھے اور صرف انہی کا تقرر ہوتا تھا جو اس امتحان میں کامیاب ہوتے تھے۔ قاضیوں کو بڑی معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ ان میں لالچ نہ پیدا ہو۔ ان کو یہ اجازت نہیں تھی کہ کوئی پیشہ یا تجارت کریں یا بازار میں خرید و فروخت کریں۔ یہ وہ ضابطہ تھا جو عرصۂ دراز کے تجربے کے بعد غیر ممالک نے بھی اختیار کیا۔

قاضیوں کے فرائض حسب ذیل تھے: تنازعات کا فیصلہ کرنا، حقوق کا استقرار کرنا، اوقاف کا انتظام کرنا، وصیتوں کا نافذ کرنا۔ بیوہ عورتوں کے نکاح کی ترغیب دینا اور اُن کے نکاح کا انتظام کرنا۔ شرعی سزائیں عملاً نافذ کرنا۔ عوام کی طرف سے سرکاری املاک میں جو دست درازیاں ہوئی ہوں انہیں رفع کرنا، اپنے ماتحتوں کو قابو میں رکھنا اور ان کے طرز عمل پر نظر رکھنا اور طاقتوروں کے مقابلے میں کمزوروں کی حفاظت کرنا۔

جب اسلامی مملکت میں بڑی تیزی سے وسعت ہوئی اور اسلامی سلطنت کے طول و عرض میں مسلم نو آبادیاں وجود میں آئیں تو قانون شریعت کے مطابق مسلمانوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے ہر جگہ قاضیوں کی عدالتیں قائم کرنی پڑیں۔ مرکزی حکومت مقامی اور صوبائی عہدہ داروں اور عمال کے کام کی نگرانی کرنے لگی اور بعض اوقات وہ ان کے فیصلوں کی نظر ثانی بھی کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفتہ المسلمین حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں اس نظر ثانی نے ایک مرتب نظام کی نوعیت اختیار کر لی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ حج کے موقع پر ہر جگہ کے لوگ جمع ہوتے ہیں انہوں نے یہ عام اجازت دی کہ جس حاکم کے خلاف کسی کو شکایت ہو وہ پیش کرے اور ملزم کی صفائی سننے کے بعد وہ فوراً مقدمے کا فیصلہ کر دیتے تھے۔

تنصیب افتا

قاضیوں کو اور عام لوگوں کو بعض شرعی مسائل کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ان کی مدد کے لئے حضرت عمرؓ نے افتا کا ایک باضابطہ نظام قائم کر دیا انہوں نے صرف چند مشہور، فاضل علماء کو اس کا مجاز کیا کہ درخواست کرنے پر وہ قانون شریعت پر اپنی رائے دیں اور اس کا کوئی معاوضہ نہ لیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ازالتہ الخلفاء میں لکھا ہے: "ابتدا میں تبلیغ کرنے کا اور اظہار رائے کا حق خلیفہ کی اجازت پر منحصر تھا اور بغیر ایسی اجازت کے نہ کوئی تبلیغ کر سکتا تھا اور نہ قانون شریعت کے متعلق رائے ظاہر کر سکتا تھا۔" حضرت عمرؓ ان معاملات میں ایسے سخت تھے کہ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ وہ ان کا بھی امتحان لے لیتے تھے جو اسی کام پر پہلے سے مامور ہوتے تھے۔ ان علماء کے ناموں کا عام اجتماعات میں اعلان کیا جاتا تھا کہ سب لوگوں کو ان کے تقرر کا علم ہو جائے۔

نظام افتاء درست کرنے کے بعد حکومت یہ مان لینے میں حق بجانب ہوگی کہ ہر شخص قانون جانتا ہے کیونکہ اس نے اس کا انتظام کر دیا کہ جو مرد اور عورت چاہے بلا کچھ خرچ کئے وہ قانونی تفصیلات معلوم کر لے جن کا اس کو پہلے علم نہ تھا بعض اوقات قاضی بھی جن کو کسی فقہی مسئلے میں شبہات ہوتے تھے مقدمہ مفتی کے پاس بھیج دیتے تھے اور اس سے اسکی وضاحت حاصل کرتے تھے۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ دور حاضر کی حکومتیں یہ مقولہ بڑے زور کے ساتھ پیش کرتی ہیں کہ "قانون سے لاعلمی کوئی عذر نہیں" لیکن انہوں نے افتاء جیسا کوئی ادارہ قائم نہیں کیا جس سے لوگ بلا روپیہ خرچ کئے قانونی رائے حاصل کر سکیں۔

قاضیوں کو جو ضابطہ کارروائی اختیار کرنا چاہئے وہ حضرت عمرؓ کے اس ہدایت نامے میں درج ہے جو انہوں نے حضرت موسےٰ اشعریؓ کو بصرے کا قاضی مقرر کرنے کے ساتھ بھیجا تھا:-

(الف) عدل کرنا اللہ کا حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے جس کا اتباع ہونا چاہیئے۔

(ب) اگر تمہارے سامنے مقدمہ دائر ہو تو احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد اس کا فیصلہ کرو اور اس فیصلے کا عمل درآمد کرو۔ کیونکہ نہایت درجہ حق فیصلہ بھی بغیر نفاذ کے بیکار ہے۔

(ج) دونوں فریقوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ ہونا چاہیئے تاکہ غریب انصاف سے مایوس نہ ہو اور ظالم کے دل میں جانبداری کی تمنا نہ پیدا ہو۔

(د) بار ثبوت مدعی پر ہے اور مدعا علیہ حلف سے دعوے کا انکار کر سکتا ہے

(ہ) فریقین عدالت سے باہر باہمی سمجھوتا کر سکتے ہیں لیکن سمجھوتے کی شرائط

مذہبی احکام یا ممانعتوں کے خلاف نہیں ہونی چاہئیں

(و) صاف مقدمات میں فیصلوں کی نظرثانی ممنوع نہیں ہے کیونکہ مرافعہ ہمیشہ اس سے بہتر ہے کہ ناانصافی برابر جاری رہے۔

(ز) قانون اور نظیر نہ ہو تو بعض مسائل میں اسی قسم کے مقدمات کی مثال سے نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے اور ہر بات پر اچھی طرح سے غور کرنے کے بعد ایسا فیصلہ دینا چاہیئے جو حق سے قریب تر اور اللہ کو زیادہ عزیز ہو۔

(ح) مدعی کو اس کی مہلت ملنا چاہیئے کہ وہ شہادت پیش کرے۔ اگر اس کے بعد وہ اپنا دعوےٰ ثابت نہ کر سکے تو اس کا مقدمہ خارج کیا جا سکتا ہے۔

(ط) ہر مسلمان کی شہادت قابل قبول ہے مگر سوائے اس کے جسے بداخلاقی کے جرم میں جسمانی سزا ہو چکی ہو یا جھوٹی گواہی دینے میں مشہور ہو۔ نیز کوئی شخص اپنے ہم نسب اور رشتہ داروں کی تائید میں گواہی نہیں دے سکتا۔

وہ قاضی شریح تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ گواہ الگ الگ پیش ہوں۔ اس سے قبل تمام گواہ عدالت میں موجود رہتے تھے اور ایک گواہ دوسرے گواہ کی شہادت سنتا تھا۔ جب شریح پر اعتراض ہوا کہ اس نے یہ حکم کس بنیاد پر دیا تو انہوں نے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ "جب تم نئی باتیں کرتے ہو تو ہم بھی نئی باتیں نکالتے ہیں۔"

یہ طریقہ کہ مدعی کے بیان کے بعد اس طرح جرح ہو کہ ایک گواہ کا بیان دوسرا گواہ نہ سنے سب سے پہلے حضرت علی رضؓ نے اختیار کیا۔ گواہوں کے بیانات میں ضرور موافقت ہونی چاہیئے یعنی ایک گواہ کے بیان سے دوسرے گواہ کے بیان کی تصدیق ہو۔

عام قاعدہ یہ تھا کہ کم از کم دو مرد گواہ ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ انصاف میں توہمات کے دخل کو روکنے، عدالت کی کاروائی کو منضبط کرنے اور اس کا یقین حاصل کرنے کے لئے گواہوں کے بیانات سچے ہوں سخت قوانین وضع کئے گئے۔

عدلیہ کے کام (یعنی مقدمات فیصل کرنے) میں تعجیل مسلمانوں کے طرز انتظام کا بڑا نمایاں اور ممتاز پہلو تھا۔ یہ ممکن ہوا طریقۂ کار کی نوعیت کی وجہ سے مسلمانوں نے جرائم کے روکنے پر اس سے زیادہ زور دیا کہ جرائم کے ارتکاب کے بعد مجرم کے نام کو شہرت دیجائے۔ ان کے طرز انتظام میں جرم کے بعد سزا پر انسداد جرائم کو ترجیح تھی۔ محتسب اور اس کے عہدہ دار یہ کوشش کرتے تھے کہ کوئی شخص گناہ (یعنی اللہ کے خلاف جرم) نہ کرنے پائے اور صاحب شرطہ اور اسکے ماتحت حکومت و دولت اور عام افراد کے خلاف جرائم کو روکنے کی۔ مقدمہ بازی اور وہ بھی بڑے پیمانے پر اس وقت اس سے کوئی واقف نہ تھا۔ دوم قاضی یہ کوشش کرتے تھے کہ ایسے ثالث مقرر کرکے، جن میں قاضی کے اوصاف ہوں فریقین کے درمیان سمجھوتہ کرادیں۔ تیسرے بہت سا دیوانی اور فوجداری کا کام دیہاتی تنظیمات اور پنچایتوں کے ذریعے سے طے ہوجاتا تھا اور جو ان سے باقی بچتا تھا وہ اضلاع کے حاکم کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو مقدمات صوبائی اور مرکزی عدالتوں تک پہنچتے تھے ان کی تعداد اتنی کم ہوتی تھی کہ قابل حیرت ہے۔

اسلامی ریاست میں اس عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ "بادشاہ کوئی غلطی کرہی نہیں سکتا" اسلام کسی انسان کو بے خطا سمجھتا ہی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خلاف دیوانی اور ٹارٹ کے مقدمات کے دائرے کی اجازت دے کر ایک بڑی بلند مثال قائم کردی۔ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رض نے صرف صوبوں ہی میں پورے وقت کام کرنے والے جج مقرر نہیں فرمائے بلکہ

مدینے میں بھی رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کے خلاف کسی نے دعوےٰ کیا تو خلیفہ کو بھی عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ چونکہ جو قانون یہ قاضی برتتے تھے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اللہ کا قانون تھا (یعنی قرآنی احکام پر مبنی) اس لیے قاضی کی عدالت ایک مذہبی ادارہ (انسٹی ٹیوشن) سمجھا جاتا تھا اور یہ قانون الہٰی بلا امتیاز مرتبہ، نسل، صنف اور قومیت منطبق ہوتا تھا۔

چونکہ اسلام دوسری مذہبی جماعتوں کے مذہبی قانون کا احترام کرتا ہے اس لیے زیر حفاظت رعایا کو قانون شریعت کے دائرہ عمل میں بغیر اس کے نہیں لایا جا سکتا تھا کہ وہ اس کی خواہش کریں۔ لیکن جب ایک مرتبہ وہ قاضی کی عدالت میں مقدمہ لے آتے تھے تو پھر وہ اس کو اپنی عدالت میں واپس نہیں لے جا سکتے تھے۔ بہرکیف یہ تھا کہ جب غیر مسلموں کے مابین تنازعات ایسی صورت اختیار کر لیتے تھے کہ امن و انتظام پر ان کے اثرانداز ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا تو حکومت ان میں مداخلت کر سکتی تھی اس لیے مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان قانونی تعلقات ان کے اپنے قانون کے مطابق رہتے تھے۔ ورثے، نکاح و طلاق اور ایسے ہی دوسرے امور میں مسلمان اپنے قانون کی پیروی کرتے تھے اور غیر مسلم اپنے قانون کی۔

اسلام کا قانون فوجداری اور قانون شہادت و معاہدہ دونوں کے لیے تھا اور مقدمے کا فیصلہ قاضی ہی کرتا تھا اور جو اصول اختیار کیا جاتا تھا وہ یہ تھا:۔

"اس دنیا کے معاملات میں غیر مسلم بالکل ایسا ہی ہے جیسا مسلمان۔"

تنصیب احتساب

اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ عام لوگوں کے اخلاق کا احتساب کرنے کے لیے

ابتدائے عہد خلافت میں کوئی باضابطہ دفتر قائم کیا گیا، شاید یہ اس حقیقت کی علامت ہے کہ اس زمانے میں ایسے لوگ زیادہ نہ تھے جو قانون شریعت کے خلاف برملا جرائم کرتے، اور دوسرے یہ کہ ہر مسلمان خلیفہ سے لے کر ادنے اشہری تک محتسب کی خدمت انجام دینے کے لئے تیار تھا۔ جرائم کے مقدمات تک کے لئے اس وقت کوئی الگ محکمہ نہ تھا۔ بعض ایسے جرائم کے مقدمات قاضی ہی کرتا تھا جیسے چوری اور زنا۔ مگر پولیس کا محکمہ مستقل طور پر قائم ہو گیا تھا اور اس وقت اس کا نام احداث تھا اور پولیس کے افسر کو صاحب الاحداث کہتے تھے بعد کو احتساب کے لئے خاص اہتمام کیا گیا اور تمام مقامات میں عہدہ دار مقرر کیے۔ مثال کے طور پر ان کے بعض فرائض یہ تھے۔

ناپ اور تول کی نگرانی، اس کی دیکھ بھال کہ لوگ سڑکوں اور رہگزروں پر عمارتیں بنا کر انہیں روک نہ دیں، جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ لادیں، شراب فروخت نہ ہو وغیرہ۔ لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ احتساب کا محکمہ بالکل الگ تھا۔ یہ فرائض بھی صاحب الاحداث ہی کو تفویض کر دئے گئے تھے۔

خلیفہ اور شعبہ عاملہ

خلیفہ دولت اسلامیہ کے شعبہ عاملہ کا افسر اعلےٰ تھا، اور یہ اس کا خاص فریضہ تھا کہ وہ تمام احکام کے نفاذ کی نگرانی کرے خواہ یہ احکام اس نے تنہا اپنی رائے سے صادر کیے ہوں یا مجلس شوریٰ کے مشورے سے۔ اس کام کی انجام دہی میں ایک چھوٹی سی مجلس عاملہ اس کی مددگار تھی جس کے ارکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجر صحابہ میں سے تھے۔ امور ریاست کے بہت سے

مسائل جیسے سپاہیوں کی تنخواہوں کا تعین، مختلف محکموں کا قیام، اسلامی علاقوں میں غیر ملکیوں کو تجارت کا حق منظور کرنا اور ان پر محصول کا تقرر وغیرہ، خلیفہ اسی مجلس عاملہ کے مشورے سے طے کرتا تھا۔

اس کمیٹی کے کئی ارکان کی سپرد مختلف شعبے تھے یعنی حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو قاضی القضاۃ مقرر فرمایا اور انہی کی سپرد زکوٰۃ کی تقسیم کا کام بھی کیا حضرت علیؓ کی سپرد مراسلت، اسیران جنگ کی نگرانی، ان کے ساتھ برتاؤ، اور فدیئے کے معاملات تھے۔ زیادہ اہم عہدوں کے لئے اشخاص کا انتخاب اعلان کے ساتھ مجلس شورےٰ میں ہوتا تھا۔ اور ایسے عہدوں پر صرف ان لوگوں کا تقرر ہوتا جنہیں مجلس شورےٰ منتخب کرتی تھی۔ مجلس شورےٰ کے علاوہ دولت کے انتظام میں ہر شہری کو بولنے کا حق تھا۔ صوبوں کے گورنر اور اضلاع کے عہدہ دار اکثر لوگوں کی منظوری سے مقرر ہوتے تھے، اور اگر کوئی والی یا کوئی دوسرا بڑا عہدہ دار لوگوں کو مطمئن رکھنے سے قاصر رہتا تھا یا اس کے خلاف کوئی شکایت ہوتی تھی اور وہ تحقیقات سے صحیح ثابت تو اس کو ہٹا دیا جاتا تھا۔

ایک خاص دفتر ان کی شکایات کے لئے قائم کیا گیا تھا جو وقتاً فوقتاً عہدہ داروں کے خلاف خلیفہ کو وصول ہوتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات یہ ہوتا تھا کہ عام شکایات کی تحقیقات کے لئے کوئی کمیشن بھیجا جاتا تھا جس میں کئی اشخاص ہوتے تھے۔ یہ عام اعلان کر دیا گیا تھا کہ حج کے موقعے پر، جہاں تمام گورنر اور اعلےٰ عہدہ دار موجود رہتے تھے، اگر لوگوں کو کوئی شکایت ہو تو وہ کر سکتے ہیں۔ ایسے مواقع پر خلیفہ بنفس نفیس شکایت سنتا تھا، ان کی تحقیقات کرتا تھا اور قصوروار کو فوراً وہیں سزا دیتا تھا۔

عہدوں کے لئے تمام انتخابات چونکہ لیاقت، اعلےٰ کردار اور اسلام

نے کے لئے خدمات کی بنا پر ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانے میں جن لوگوں کے تقررات ہوئے وہ سب نہایت لائق تھے اور ان کے کردار نہایت بلند۔ مگر پھر بھی اس خیال سے کہ انتظام حکومت میں دیانت برتی جائے، کام خوبی سے ہو اور لالچ میں مبتلا نہ ہوں، اعلےٰ عہدہ داروں کو بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد میں اسلام کی سیاسی تنصیبات (سیاسی ادارے، تنظیمات اور معمولات اور نظامات وغیرہ) پورے طور پر ترقی کر چکی تھیں اور پورے طور پر اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی - یہ اسلامی ریاست اللہ کی حاکمیت اور آدمی کی نیابت و خلافت کے عقیدے پر قائم تھی۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ حقیقت میں اللہ قانون عطا کرنے والا ہے اور آدمی کا فرض اوّلیں یہ ہے کہ اس قانون کو نافذ کرے جو اللہ نے وحی کیا ہے۔ وہ حکومت جو اس تصور کا نفاذ کرے اس کا نظام جمہوری ہوتا ہے۔ مگر مغرب کے بگڑے ہوئے مفہوم میں جمہوری نہیں بلکہ اسلام کے مفہوم میں۔ یعنی شورے ان اصولوں کے مطابق، اور اپنی حکومت کے انتخاب کا حق ان معیاروں کے مطابق ہو جو شریعت نے متعین کر دیے ہیں خلیفہ کے لئے یہ حکم ہے کہ سادگی، کفایت شعاری اور مخلوق کی خدمت میں ہمہ تن مصروفیت کے ساتھ زندگی بسر کرے اور مسلمانوں کے مسلمہ نمائندوں کے مشورے کے مطابق امور دولت و ریاست کا انصرام کرے۔

خلیفہ ریاست کی عاملہ کا افسر اعلےٰ ہوتا ہے اس لئے اس کو اپنی پالیسی کے نفاذ اور احکام شریعت کی تعمیل کے لئے کافی اختیارات ہوتے ہیں۔ عدل و انصاف کے انتظام کے لئے قضا کی انسٹی ٹیوشن (نظام) ہے اور مذہبی امور میں لوگوں کی عام رہنمائی کے لئے افتا کی انسٹی ٹیوشن (نظام) ہے۔ مجموعی طور پر یہ تمام نظامات ادارے تنصیبات مل کر اسلامی ریاست کا نظام سیاسی بن جاتی ہیں۔ یہ اجتماعیات کی ایک

مشہور حقیقت ہے کہ تنصیبات کو جڑ پکڑنے میں بڑا طویل زمانہ صرف ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سلسلہ تنصیبات شروع کیا تھا خلفائے راشدین کے عہد میں وہ کمال کو پہنچ گیا۔ تاریخ کے طالب علم کو ایسا نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بیج بویا تھا اور جو آپ ہی کے زمانے میں خاصہ پودا ہو گیا تھا، خلفائے راشدین کی خدمت و توجہ سے عظیم تناور درخت بن گیا۔ اور وہ اسلامی ریاست کا یہی شجر طیبہ ہے جس کو مسلمان ہر عہد اور ہر آب و ہوا کیلئے قابل تمنا سمجھتے ہیں۔

معاشی تنصیبات

اب ہم معاشی تنصیبات پر آتے ہیں جنہوں نے سیاسی تنصیبات ہی کی طرح ترقی کی۔ سیاسی تنصیبات وہ اعضا تھے جن کے ذریعہ اسلامی ریاست کے معاشی نصب العین کا نفاذ ہوا۔ اختصار کے ساتھ یہ نصب العین اس پر مشتمل ہے کہ لوگوں میں معاشی ترقی اور جدوجہد کے لئے مناسب اقدامی شوق پیدا ہو اور اجتماعی نظام ایسا مرتب ہو کہ ہر قسم کی ناواجب نفع اندوزی یا اخذ و یافت رفع ہو کر حقیقی معنے میں رعایا پرور ریاست قائم ہو جائے۔ نجی ملکیت کی اجازت دی گئی۔ لیکن ہر نوعیت سے اس کا غلط استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔ سود اور ساہوکاری یا ربا منسوخ کیا گیا زکوٰۃ نافذ کی گئی۔ معاشی زندگی کی اس طور پر تنظیم کی گئی کہ دولت چند افراد کے ہاتھوں میں مجتمع نہ ہو اور معاشرے کے تمام عناصر میں گردش کرے اور بالخصوص امیروں کے پاس سے غریبوں کے پاس جاتی رہے۔ قانون وراثت کا استعمال اس مقصد کے لئے کیا گیا کہ دولت دور دور اور وسعت کے ساتھ تقسیم ہو۔ غریبوں

ضرورت مندوں کے اجتماعی تحفظ کے لئے ایک منصوبہ جاری کیا گیا۔ جس عہد کا یہ ذکر ہے اسی میں یہ مقاصد کامل طور پر نافذ العمل ہو گئے۔ اب ہم ان تنظیمات پر تبصرہ کرتے ہیں جو عہد خلافت میں ان تصورات کے نفاذ کے لئے قائم ہوئیں۔

دیوان (محکمہ مالیات)

خلیفہ کے فرائض میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ مال گزاری جمع کرے اور قانون شریعت کے مطابق اسے خرچ کرے۔ اور اسی غرض سے حضرت عمر رضؓ نے ایک محکمہ قائم کیا جس کا نام دیوان تھا۔ اس محکمے کے دو شعبے تھے : ایک شعبہ آمدنی اور دوسرا شعبہ خرچ۔ شعبہ آمدنی :۔ اس شعبہ کا کام یہ تھا کہ مندرجہ ذیل وسائل کی تمام آمدنی وصول کرے۔

خراج :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں خراج کی زمینیں بہت تھوڑی تھیں اور ان کے انتظام کے لئے کسی بڑے عملے کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ فیصلہ ہوا کہ تمام مفتوحہ زمینیں حسب سابق سپاہیوں میں تقسیم نہ ہوں، بلکہ وہ مفتوح لوگوں کے پاس رہنے دی جائیں۔ اب ان خراج کی زمینوں کا رقبہ خاصہ وسیع ہو گیا جس میں سلطنت روم کا کچھ حصہ تھا اور سلطنت فارس پوری تھی۔ اس لئے اس علاقے کی املاک کے لگان اور مالگزاری کے تقرر، اس کی تحصیل اور اس کے خرچ کے لئے ایک بڑے نظام کی ضرورت ہوئی۔ مفتوحہ زمینوں کی اچھی طرح پیمائش، اور تقرر لگان کی ضرورت کے لئے زمین کی قسم اور نوعیت کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی گئی۔ اس طرح نقد یا جنس کی صورت میں زمینوں پر معقول لگان مقرر ہوا۔ اگر لگان جنس کی صورت میں ہوتا تو وہ پیداوار کے نصف سے تجاوز نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ زمینیں مسلمان نہیں خرید سکتے تھے اور یہ ایک قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ خراجی زمینیں عشری نہیں بن سکیں گے۔ غیر مسلموں کے لئے حق ملکیت منظور کیا گیا اور ان کی زمینیں ناقابل انتقال قرار دی گئیں۔ جو لگان ایک مرتبہ مقرر کر دیا جاتا تھا اس میں اضافہ نہیں ہوتا تھا۔

فئے :۔ وہ جائداد منقولہ اور غیر منقولہ ہوتی تھی جو بغیر واقعۂ جنگ کے قبضہ حکومت میں آجائے۔ اس غنیمت میں سپاہیوں کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ خلفائے راشدین کے عہد میں حکومت کو فئے کے طور پر بہت بڑی املاک ملیں۔ مصر اور شام میں امرار اور زمندار نے جو بڑی بڑی نجی جائدادیں چھوڑیں اور جو پہلے سرکاری زمینیں تھیں اس مد میں داخل ہوئیں۔ وہ زمینیں جو آتش خانوں کے لئے وقف تھیں اور جو سڑکوں کی مرمت اور رسل و رسائل کے اخراجات کے لئے تھیں وہ بھی فئے قرار دی گئیں مگر فئے کی زمینیں سپاہیوں کو دی جا سکتی تھیں اس طرح یہ عشر میں تبدیل ہو سکتی تھیں۔

جزیہ :۔ غیر مسلموں سے جان و مال کی حفاظت اور فوجی خدمت سے استثنار کے عوض وصول کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سب کے لئے ایک دینار جزیہ مقرر کر دیا گیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے جزیئے کے نرخ میں یہ تبدیلی کی، اس کو لوگوں کے معاشی وسائل کے مطابق کر دیا۔ انہوں نے اس کا تقرر اس طرح کیا کہ امرار سے چار دینار فی کس، اوسط درجے کے لوگوں سے دو دینار فی کس اور غریبوں سے ایک دینار۔

مستشرقین کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ جزیہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تفریق اور تمیز کے لئے تھا بلکہ یہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ بہت بڑی رعایت تھی جو لوگ فوجی خدمت دینے کے لئے آمادہ ہوتے تھے وہ اس سے مستثنےٰ کر دیئے جاتے

تھے۔ یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا جو غیر مسلم سال میں ایک مرتبہ فوجی خدمت انجام دے اس سے پورے سال کا جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اگر مسلمانوں نے کبھی یہ محسوس کیا کہ وہ غیر مسلموں کی حفاظت سے قاصر ہیں تو وصول کیا ہوا جزیہ بھی ان کو واپس کر دیا جاتا تھا۔

یہ واقعہ کہ جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا جاتا تھا جو اسلحہ کے استعمال پر قادر تھے مذکورہ بالا بیان کا ثبوت ہے کہ یہ ٹیکس غیر مسلموں سے فوجی خدمت کے استثنار کے بدلے میں تھا۔ عورتیں، بچے، معذور مرد اور مذہبی پیشوا اس سے مستثنیٰ تھے

عشور:۔ درآمد پر ٹیکس تھا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں سے لیا جاتا تھا۔ یہ ٹیکس سال میں ایک مرتبہ اس مال پر عائد ہوتا تھا جس کی قیمت دو سو (۲۰۰) درہم سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس محصول کا نرخ مسلمانوں سے ڈھائی فی صدی، غیر مسلم سے پانچ فی صدی اور اس ملک کے تاجروں سے جو خلافت کے مقابلے میں جنگ کر رہا ہو دس فی صدی تھا۔

خمس:۔ وہ غنیمت جو مجاہدین کے ہاتھ آتی تھی اس کا ۴/۵ انہی مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور ۱/۵ مرکزی حکومت کا ہوتا تھا۔ قرآن کی ایک آیت کے مطابق یہ پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو ملتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے۔ ایک حصہ اپنے لئے، ایک حصہ اپنے رشتہ داروں کے لئے اور تیسرا حصہ مسکینوں، یتیموں اور مسافروں کیلئے جن کا قرآن میں ذکر ہے۔

زکواۃ:۔ زکواۃ کے قواعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی مقرر کر دیئے تھے خلیفہ بھی اس ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ حضرت عمر رضی۔ نے دولت اسلامیہ کے فائدے کے لئے زکواۃ کے قاعدوں میں خفیف تبدیلی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے عہد میں جب گھوڑے صرف سواری کے لئے رکھے جاتے تھے، انہیں زکوٰۃ سے مستثنے کیا گیا۔ لیکن حضرت عمر رضہ کے عہد میں جب گھوڑوں کی تجارت بڑی نفع بخش ہوگئی تو انہوں نے تجارت کے گھوڑوں پر اسی طرح زکوٰۃ عائد کردی جس طرح دوسرے جانوروں پر تھی۔

صدقات :- وہ ٹیکس تھے جو مسلمان اپنی خوشی سے حکومت کو دیتے تھے۔ بعض ان میں سے لازمی بھی تھے جیسے صدقہ عید الفطر اور قربانی کے جانوروں کی کھالیں، لازمی صدقات ضرور بیت المال میں داخل کئے جاتے تھے۔

عُشر :- وہ محصول تھا جو ان مسلمان زمینداروں سے وصول ہوتا تھا۔ جن کے قبضے میں حضرت عمر فاروق رضؓ کے اس حکم سے قبل کہ مسلمان غیر مسلموں کی زمینیں حاصل نہ کریں، غیر مسلموں کی زمینیں تھیں۔ ان زمینوں کا محصول پیداوار کا دسواں حصہ ہوتا تھا بشرطیکہ انہیں آبپاشی کی قدرتی سہولتیں میسر ہوں اور اگر ان میں ڈولوں یا لیٹوں سے آپ پاشی ہوتی تھی تو پیداوار کا بارہواں حصہ۔

اوقاف :- وہ جائداد تھی جو مسلمان اللہ کے واسطے مخصوص کر دیتے تھے۔ ایسی جائداد کی آمدنی بیت المال میں جمع ہوتی تھی۔

اموال فاضلہ :- یا متفرق آمدنی وہ تھی جو لاوارث جائدادوں سے ہوتی تھی یا ان جائدادوں سے ہوتی تھی یا ان جائدادوں سے جو مرتد نو مسلم چھوڑ کر اسلامی ملک سے بھاگ جاتے تھے۔

بیت المال کی چار مدیں تھیں :-

پہلی مد میں خمس (غنیمت کا پانچواں حصہ) چھپے ہوئے خزانے (یعنی دفینے) اور صدقات جمع ہوتے تھے۔

دوسری مد میں زکوٰۃ، عُشر اور عشور جو مسلمانوں سے لئے جاتے تھے۔

تیسری مد میں خراج، فئے، جزیہ اور عشور جو غیر مسلموں سے وصول ہوتے تھے۔ اس میں ان اراضیات کی آمدنی بھی شامل ہوتی تھی جو معین سالانہ لگان پر دی جاتی تھیں۔

چوتھی مد میں وہ آمدنی جمع ہوتی تھی جو متفرق وسائل سے آتی تھی۔ جو آمدنی اول اور دوم مدّات میں جمع ہوتی تھی وہ مندرجہ ذیل آٹھ مدات میں خرچ ہوتی تھی۔

(۱) مساکین (۲) ضرورت مند (۳) محصلین زکوٰۃ (۴) تالیف قلوب (۵) غلاموں کی آزادی (۶) ایسے لوگوں کے قرضوں کی ادائیگی جن میں قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو (۷) اللہ کی راہ میں (۸) مسافروں پر۔

تیسری مد کی آمدنی ہر قسم کے بھتوں، عطیات یا وظائف پر اور انتظام حکومت پر خرچ ہوتی تھی۔

چوتھی مد کی آمدنیوں میں سے رفاہ عامہ کے کاموں، یتیم بچوں کی پرورش اور دوسرے خیراتی امور پر خرچ ہوتی تھی۔

مگر خلیفہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ ایک مد کا روپیہ دوسری مد کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بطور قرض یا اشد ضرورت میں اس کا حساب درست کرنے کے لئے منتقل کر دے۔

مدد معاش کے لئے وظائف :- جب بحرین سے کثیر دولت آئی تو خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ نے یہ طے کیا کہ بیت المال قائم کیا جائے۔ اس آمدنی میں ان خراجی زمینوں کی بہت ہی بڑی آمدنی کا مزید اضافہ ہوا جو غیر مسلموں کے قبضے میں چھوڑ دی گئی تھیں۔ اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہ خطیر رقم ایسے لوگوں کی ضروریات پر خرچ کی جائے جن کی کوئی خدمات ہوں اور جو کچھ ان کو دیا جائے وہ

پابندی کے ساتھ معقول وجوہ کی بنا پر ہو۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ آمدنی میں سے جو اخراجات ہوں ان میں سب سے مقدم شعبہ انتظام ملکی کو قرار دیا جائے۔ اس کے بعد فوج کی ضروریات کو۔ جو رقم اس سے فاضل ہو وہ جماعت مسلمین کی مدد معاش پر صرف ہو۔ اس کے لئے ایک رجسٹر بنا دیا گیا جس میں ایسے تمام عربوں اور غیر عربوں کے نام درج کئے گئے جو وظائف کے مستحق تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی اس فہرست کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ داری اور ان خدمات کی بنا پر کیا جو کسی نے اسلام کے لئے انجام دی تھیں۔

دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی حکومت نے ملک کی پوری آبادی کے خورد و نوش اور لباس کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی ہو۔

جب حضرت عمرؓ نے پوری مسلم آبادی کی ضروریات مہیا کر دیں تو فطرتاً انہوں نے یہ توقع کی کہ ہر مسلمان دولت اسلامیہ کی فوجی خدمت بطیب خاطر انجام دیگا لہذا فوجی اور سیاسی وظائف ایک ہو گئے۔ اس سے امویوں کے عہد میں حکومت کو کچھ دشواریاں پیش آئیں۔ بعض وظیفہ یاب یہ سمجھنے لگے کہ ان پر فوجی خدمت لازمی نہیں ہے۔

فوجی تنظیم

اسلامی تعلیمات چونکہ عام طور پر نوع انسانی کے مفاد میں ہیں اس لئے وہ مفاد حاصلہ کے خلاف ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے تھے ان کے خلاف ظلم اور شر کی طاقتوں نے ہر طرف سے سر اٹھایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فوراً خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق کو وہ عظیم اور سخت دشواریاں درپیش آئیں جن پر قابو پانا مشکل تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو ان اہل شر کے خلاف اعلان جہاد کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ انہوں نے تمام عرب میں اعلان کر دیا کہ ہر بالغ مرد جہاد کے لئے کمربستہ ہو جائے اور انہوں نے گیارہ مہمات کی تنظیم کر کے اپنے مختصر عہد حکومت میں جو دو سال سے بھی کم تھا، پورے جزیرۃ العرب کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

جس وقت حضرت ابوبکرؓ ملک میں امن و انتظام قائم فرما رہے تھے انہوں نے یہ دیکھا کہ دونوں طرف کے سرحدی قبائل کو فارس اور بازنطین کی سلطنتیں شورش پر ابھار رہی ہیں۔ یہ دونوں سلطنتیں عہد رسالت ہی سے اس ابھرتی ہوئی اسلامی دولت سے جل رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات واقع ہو گئی اور اس سے ان کو یہ موقع ملا کہ عرب کے داخلی معاملات تک میں شر کے ساتھ مداخلت کریں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بڑے مدبر تھے عرب میں امن قائم کرتے ہی انہوں نے ان دونوں مفسدہ پرداز سلطنتوں کو سزا دینے کے لئے اقدامات کئے۔ اس طرح وہ اس زمانے کی دو نہایت طاقتور سلطنتوں کے ساتھ دائمی جنگ میں گھر گئے۔

وہ یہ حالات تھے جن میں حضرت عمرؓ نے عنان خلافت اپنے ہاتھ میں لی۔ ان کو وہ جنگ جاری رکھنی پڑی جو ان کے پیشرو کے عہد میں شروع ہوئی تھی۔ انہوں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ ان کو اہل فارس اور بازنطینیوں کے خلاف اس وقت تک جنگ کرنی ہے کہ ان کا فتنہ ختم ہو جائے۔ اسی وجہ سے انہوں نے پوری مسلم آبادی کو جنگی مقاصد کے لئے تیار کر دیا اور فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ انہوں نے ہر بالغ مسلمان کو مجاہد قرار دیا اور اس کے لئے یہ لازم کہ دولت

اسلامیہ کو جس وقت اس کی خدمت درکار ہوں وہ حاصل کی جا سکیں۔ اس معاملے میں کوئی استثنار نہیں تھا۔ یہی مقصد مد نظر تھا جس کے لئے حضرت عمرؓ نے مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم کرنے کی ممانعت فرمائی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کی بھی ممانعت کی کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سے کاشت کے لئے زمین خریدے۔ حضرت عمرؓ یہ چاہتے ہی نہ تھے کہ مسلمان کاشت و زراعت کے کام میں مصروف ہوں۔ مجاہد یا اللہ کے سپاہی ہونے کی حیثیت سے ان کو حکم پاتے ہی بلا تاخیر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا تھا۔

مسلم آبادی دو فہرستوں میں تقسیم تھی :۔

(۱) باقاعدہ سپاہی جو ان چھاؤنیوں میں رہتے تھے جو ہر صوبے میں ان کے لئے تعمیر کی گئی تھیں (۲) رضاکار جن کو فوجی تربیت تو دی جاتی تھی لیکن باقاعدہ سپاہی کے مقابلے میں حکومت سے ان کو کم وظیفہ ملتا تھا۔ ان کی خدمات صرف اس وقت حاصل کی جاتی تھیں جب حکومت کو ضرورت ہوتی تھی۔ زیادہ اور معیّن وظائف باقاعدہ افواج کو ملتے تھے۔

غنیمت میں سے ۴/۵ حصے کے علاوہ جو سپاہیوں کو حسب ذیل تناسب کی بنا پر ملتا تھا کہ سوار کو دو حصے، پیدل کو ایک حصہ، سپاہی کی کم از کم تنخواہ دو سو درہم سالانہ تھی۔ بعد میں بڑھ کر یہ تین سو درہم ہو گئی۔ افسروں کی تنخواہ سات ہزار درہم سے دس ہزار درہم سالانہ تک ہوتی تھی۔ اوسطاً سپاہی کی سالانہ تنخواہ چھ سو درہم تک پہنچ گئی تھی۔ مزید براں سپاہی کے ہر بیوی اور بچے کو کھانے کی جنس، لباس جوتہ اور بھتہ مفت ملتا تھا۔

ابتدا ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بڑا خیال تھا کہ مسلم سپاہیوں کے اخلاق بہت اچھے ہوں۔ چونکہ مسلمان سپاہی اللہ کی راہ میں

لڑتے تھے اور وہ مجاہدین فی سبیل اللہ کہے جاتے تھے اس لئے میدان جنگ میں انکو یہ دکھانا پڑتا تھا کہ ان کا طرز عمل اور کردار مثالی ہے۔ وہ شراب نوشی، جوئے اور زنا کے جرائم سے جو آجکل کی فوجوں میں عام ہیں بالکل پاک تھے۔ ان کی سیرتیں مثالی تھیں۔ اسلام کے اعلےٰ مقاصد کے ساتھ ان کی شیفتگی انہیں دولت و حکومت کی خدمت پر ابھارتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیوی مفاد سے انہیں کوئی علاقہ نہیں تھا وہ بس جوش جہاد سے سرشار رہتے تھے۔ مسلم سپاہی کے لئے غازی ہونا کوئی قابل تمنا چیز نہیں تھی وہ صرف شہادت کی آرزو میں لڑتا تھا۔ مسلمانوں کی فوج تنظیم میں ایسی چست اور اپنے سردار کے حکم کی تعمیل میں ایسی تیار تھی کہ دنیا نے اس سے قبل اور اسکے بعد پھر کبھی نہیں دیکھی۔

فوج کی تقسیم

فوج کی تنظیم کے لئے حضرت عمرؓ نے پوری اسلامی ریاست کو نو فوجی علاقوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ تقسیم سیاسی تقسیم سے الگ تھی۔ ان میں سے ہر ایک کو جُند کہتے تھے۔ فوجی اضلاع حسب ذیل تھے:۔

مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، مصر، دمشق، حمص، فلسطین۔ ہر فوجی چھاؤنی میں بڑے بڑے اصطبل تھے اور ان میں چار چار ہزار گھوڑے رہتے تھے کیل کانٹے سے بالکل درست اور خدمت کے لئے ہر وقت تیار۔ پیش نظر یہ تھا کہ فوری ضرورت کے لئے چھتیس ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رہیں۔ ان سب مقامات میں سپاہیوں کے لئے باضابطہ بارکیں تھیں ان گھوڑوں کی پرورش اور تربیت کے لئے خاص اہتمام تھا۔ دارالخلافہ سے صرف چار منزل فاصلے پر گھوڑوں کے لئے چراگاہیں تھیں۔ گھوڑوں کے پٹھوں پر داغ اور ان میں یہ لکھا ہوتا تھا " اللہ کی راہ میں

جنگ کرنے والا!" ان بڑے مرکزوں کے علاوہ تمام ممالک مفتوحہ کے بڑے شہروں میں اور دوسرے موزوں مقامات پر بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں
ہر فوجی مرکز میں ایک دفتر تھا اور ایک سامان رسد کا کوٹھار۔ ہر فوجی مستقر کے ساتھ تنخواہ تقسیم کرنے کے لئے ایک افسر رہتا تھا جس کو عریف کہتے تھے
فوجی سپاہیوں کی کتنی بڑی تعداد تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بقول ابن سعد ہر سال تیس ہزار نئے رنگروٹوں کے نام وظیفے کے رجسٹر میں درج ہوتے تھے۔ سپاہیوں کو خود اپنا گھوڑا رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن اگر کسی کی حیثیت اتنی نہیں ہوتی تھی کہ گھوڑا خریدے تو اس کو سرکاری اصطبل سے گھوڑا مل جاتا تھا۔

ابتدا میں سپاہیوں کے خورد و نوش کے لئے اجناس کے ذخائر رکھنے اور ان کی تقسیم کا کمسریٹ کے طریقہ پر انتظام نہیں تھا لیکن بعد میں کمسریٹ کا محکمہ علیحدہ قائم ہوا جس کو اہرا کہتے تھے۔ تمام اجناس خوراک ایک جگہ جمع رکھی جاتی تھیں اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو فی کس ایک من، دس سیر غلہ، ۱۲ اسیر روغن زیتون اور ۱۲ اسیر سرکہ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر سپاہی کو اپنی ذاتی ضرورت کی چند چیزیں رکھنی پڑتی تھیں۔ مثلاً سوئیاں، ایک بڑا سوا، روئی، قینچی، کھانے کا ایک جھولا اور چھینی۔ فوج کے ہر دستے کے ساتھ خزانے کا ایک دفتر، ایک محاسب، قاضی اور کئی کئی ترجمان، طبیب اور جراح رہتے تھے۔

جاسوس اور خبر رساں

جاسوسی اور خبر رسانی کے شعبوں کی بڑی خوبی سے تنظیم کی گئی تھی ان کیلئے عراق اور شام کے عربوں میں سے، جن کا ایک حصہ اسلام لاچکا تھا، بڑی سہولت سے آدمی مل جاتے تھے۔ وہ ان ملکوں میں زمانہ دراز سے رہتے تھے۔ وہاں کوئی

واقعہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا جس کا علم انہیں نہ ہو۔ انہیں یہ اجازت تھی کہ اپنی حقیقت ظاہر نہ کریں۔ ظاہری صورت میں وہ چونکہ عیسائیوں اور آتش پرستوں سے ملتے جلتے ہوتے تھے اس لئے وہ جہاں چاہتے تھے دشمنوں کی فوجوں میں مل جاتے تھے اور جس قسم کی اطلاع چاہتے تھے حاصل کر لیتے تھے۔ اس عہد کی غیر مسلم محکومتیں ایسی نہیں کہ غیر مسلم تک اپنے ہم مذہب فرمانرواؤں کے خلاف جاسوسی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے ہم مذہب فرماں روا ان کے اتنے ہمدرد نہ تھے جیسے مسلمان فرمانروا۔

ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے۔ "جب ذمیوں نے دیکھا کہ مسلمان اپنے عہد کے بڑے پابند ہیں اور برتاؤ میں مہربانی سے پیش آتے ہیں تو وہ اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے مسلمانوں سے دوستی کرنے لگے۔" ان شہروں سے جو مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر لیتے تھے ان کو ذمیوں کے خلاف جاسوسی کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ اور یہ مسلمانوں کو ذمیوں کی نقل وحرکت کی اطلاعیں دیتے تھے۔"

اسلام سے پہلے عربوں کا طریقۂ جنگ بہت ہی پرانا تھا۔ دونوں طرف سے آدمیوں کے ہجوم آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے ان میں کوئی صف بندی یا کسی قسم کی ترتیب نہیں ہوتی تھی۔ دونوں طرف سے ایک ایک آدمی نکلتا تھا اور ان کے درمیان لڑائی ہوتی تھی اور پوری فوج اس لڑائی کا خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہتی تھی۔ اس طرح طرفین کے کئی کئی آدمی انفرادی جنگ کرتے تھے۔ اس کے بعد دونوں فوجیں آپس میں گتھ جاتی تھیں۔ صف بندی کا طریقہ اسلام نے رائج کیا۔ اب فوج مختلف فریقوں میں تقسیم ہونے لگی جیسے میمنہ، میسرہ، مقدمۃ الجیش وغیرہ۔ لیکن ہر فریق الگ لڑتا تھا کیونکہ پوری فوج کا کوئی ایک سپہ سالار نہیں ہوتا تھا جنگ یرموک سے حضرت خالد ابن ولید نے ایک سالار اعظم کے تحت میں تنظیم کے ساتھ جنگ کا

طریقہ نکالا۔ اس وقت سے پوری فوج چھتیس(۳۶) دستوں میں تقسیم ہونے لگی اور یہ سب باہمی ربط کے ساتھ حضرت خالدؓ کی کمان میں لڑتے تھے۔

حبیبی نے اپنی کتاب موسومہ "عربوں کا انتظام" میں لکھا ہے: خلافت راشدہ کا عہد ختم ہونے تک مسلمانوں نے اپنی فوج کی تنظیم میں بڑی خوبی اور تکمیل پیدا کر لی تھی۔ اس کے سپاہیوں میں بڑی ضابطہ بندی تھی وہ اس زمانے کے تمام اسلحہ مہارت کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے عمدگی کے ساتھ کوچ کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ نقل و حمل اور رسد رسانی کا انتظام ایسا تھا جیسا کہ اول درجہ کی فوج کا ہونا چاہئیے۔ دفاع، محاصرہ بندی، ہجوم کر کے قلعے پر قبضہ کرنا اور تھوڑی تعداد سے بڑی فوجوں کو ہزیمت دینا۔ ان فنون میں انہوں نے بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے ایک نرالا طرز جنگ ایجاد کیا تھا۔ تنظیم رسد رسانی، اسلحہ، فنی مہارت، سپاہیوں اور کمانداروں کے اوصاف اور سب سے بڑھ کر ان کے اخلاق مسلمانوں کی فوج اپنے ان محاسن کے اعتبار سے اس دور کی تمام افواج میں بہترین تھی۔

ابتدا میں عرب سمندر سے ڈرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد کہ بحر احمر میں ایک چھوٹی سی فوجی جمعیت پوری کی پوری غارت ہو گئی۔ عمرؓ اعظم تک کو سمندر پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جناب معاویہ کو سمندر کی راہ سے قسطنطنیہ پر حملے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو یہ اجازت مل گئی مگر ابتدا میں بحری خدمت محض رضاکارانہ تھی۔ جب حضرت معاویہؓ کو اپنی شام کی گورنری کے زمانے میں منظوری مل گئی تو انہوں نے ہر شعبے کو بڑی تیزی سے ترقی دی۔

سنہ ۵۶ھ تک مسلمانوں نے اپنے بحریے کی اس حد تک تنظیم کر لی تھی کہ انہوں

نے بازنطینیوں سے جزیرۂ روڈس فتح کرلیا اور یونانیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے بحری بیڑے کا ایسا رعب تھا کہ وہ اس سے ہر وقت ڈرتے رہتے تھے۔

۳۴ھ میں حضرت معاویہؓ نے بازنطین کے خلاف دو سو جہازوں کی مہم بھیجی اور بازنطینی مسلمان حملہ آوروں کے مقابلے میں چھ سو جہاز لائے مگر مسلمانوں نے دشمن کے بیڑے پر ایسی ہمت سے حملہ کیا کہ ان کو عظیم بحری فتح حاصل ہوئی اور بحر روم میں ان کو اس فتح سے بحری غلبہ حاصل ہوگیا۔

صوبائی تنظیم

یہ تاریخی حقیقت سمجھنے کے بعد کہ انتظام کی خوبی اس پر منحصر ہے کہ ملک کو ایسے انتظامی حلقوں میں تقسیم کیا جائے جیسے صوبے، اضلاع اور اضلاع کے علاقے حضرت عمرؓ نے سلطنت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا۔

اس کے بعد سب سے زیادہ اہم کام یہ تھا کہ ان کے لئے موزوں افسر مقرر کئے جائیں۔ اس انتخاب کے لئے جو اوصاف معین کئے گئے، وہ قابلیت، سیرت، اور وہ خدمات تھیں جو شخص زیر انتخاب نے اسلام کے لئے کی ہوں۔ چونکہ یہ عہدہ دار مدینے سے منتخب کئے جاتے تھے اس لئے خلیفہ جو حاکم تقرر تھا خود ان سے واقف ہوتا تھا۔ تقرر کا طریقہ یہ تھا کہ تمام بڑے عہدے دار خلیفہ مجلس شوریٰ کے مشورہ سے مقرر کرتا تھا اور مجلس شوریٰ کے تمام ارکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ تھے۔

بعض اوقات باشندگان صدر مقامات، وصوبہ جات و اضلاع کو بھی یہ موقع دیا جاتا تھا کہ وہ لائق آدمی منتخب کریں اور جو شخص جو اس طرح انتخاب میں آتا تھا وہ صوبہ کا حاکم بنا دیا جاتا تھا۔ یہاں تک صوبہ کے گورنروں اور کمانڈروں جیسے عہدہ

داروں کے تقرر میں لوگوں کی رائے پر غور کیا گیا۔ اگر کوئی گورنر لوگوں کو خوش اور مطمئن نہیں رکھ سکا تو اس علاقے کے لوگوں کی شکایت پر اس کو وہاں سے فوراً ہٹا دیا گیا۔

صوبوں کے عہدہ دار

صوبوں کے بڑے عہدہ دار یہ ہوتے تھے:۔ والی یا گورنر، کاتب یا چیف سیکریٹری کاتب الدیوان یا فوج کے سیکریٹریٹ کا چیف سیکریٹری، صاحب الخراج یا کلکٹر مالگزاری صاحب الاحداث یا افسر پولیس، صاحب بیت المال، افسر خزانہ اور قاضی یا چیف جج۔ صوبوں میں افسر فوج بھی ہوتا تھا۔ اگرچہ اکثر گورنر ہی صوبوں کی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ ہوتا تھا۔ گورنر کا عملہ بڑا اور مستقل ہوتا تھا اور اس کا تقرر راست دربار خلافت سے عمل میں آتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے عمار کو کوفے کا گورنر مقرر کیا تو ان کے ساتھ دس معزز آدمی بھیجے۔

ہدایت نامہ

جب کوئی شخص حکومت کے کسی عہدے پر مقرر کیا جاتا تھا تو اس کو ایک ہدایت نامہ دیا جاتا تھا۔ جس میں اس کے تقرر کی شرائط اور اس کے اختیارات اور فرائض تعین کے ساتھ بیان ہوتے تھے۔ اس پر مدینے کے متعدد معزز مہاجرین اور انصار کی شہادت ہوتی تھی۔ جب یہ عہدہ دار اپنے مستقر پر پہنچتا تھا تو لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کی دعوت دیتا تھا، وہ ہدایت نامہ ان کے سامنے پڑھتا تھا تاکہ سب لوگ اس کے اختیارات سے واقف ہو جائیں اور اگر وہ کبھی اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرے تو اس سے باز پرس کر سکیں۔ حضرت عمرؓ اس کا بڑا اہتمام

کرتے تھے کہ سرکاری عہدہ داروں کی ذمہ داریوں اور پابندیوں سے ہر شخص اچھی طرح واقف رہے اس کے لئے انہوں نے بہت سے مقامات اور بہت سے مواقع پر تقریریں کیں۔

ایک مرتبہ ایک جلسہ عام میں انہوں نے سرکاری عہدہ داروں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "یاد رکھئے میں نے آپ کو لوگوں پر آمر اور جابر کی حیثیت سے مقرر نہیں کیا ہے بلکہ رہنماؤں کی حیثیت سے مقرر کیا ہے تاکہ لوگ آپ کی مثال کی پیروی کریں ان کی ناواجب تعریف نہ کیجئے جس سے وہ اپنے متعلق مغالطے میں مبتلا ہو جائیں، ان پر اپنے دروازے بند نہ کیجئے کہ جو ان میں بہت طاقتور ہیں وہ کمزوروں کو کھا جائیں، اور ان کے ساتھ اس طرح پیش نہ آئے جیسے آپ ان سے افضل ہیں، کیونکہ یہ ظلم ہے۔"

تمام گورنروں کو یہ حکم تھا کہ سادگی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کریں ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوں (کیونکہ وہ اترا کر چلتا ہے) نہ باریک کپڑے پہنیں، نہ چھنا ہوا آٹا کھائیں، نہ دربان رکھیں تاکہ لوگ ان کے پاس آسانی سے آسکیں۔ یہ شرائط افسران کے تقرر نامے میں درج کر دی جاتی تھیں اور جلسہ عام میں ان کا اعلان کیا جاتا تھا۔

صوبوں میں طرز حکومت

صوبوں کا طرز حکومت وہی تھا جو مرکز میں تھا۔ گورنر خلیفہ کے نمائندے کی حیثیت سے صوبوں میں شعبہ عاملہ کا افسر اعلےٰ ہوتا تھا۔ بالکل خلیفہ ہی کی طرح وہ بھی اپنے صوبے کی مرکزی مسجد میں آکر اپنے عہدے کا چارج لیتا تھا اور لوگوں کے اجتماع میں اپنا تقرری نامہ پڑھتا تھا جس میں اس کی ذمہ داریاں اور فرائض

مذکور ہوتے تھے تاکہ لوگ اس سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ خلیفہ کے نمائندے کی حیثیت سے اس کا یہ کام بھی تھا کہ جماعت کی نماز میں امامت کرے اور جمعہ کے روز اور عیدین کے موقع پر خطبات دے۔ اس کے دوسرے فرائض یہ تھے، کہ سرحدوں کی حفاظت کرے، عدل قائم رکھے، قانون شریعت کے مطابق ٹیکس وصول کرے اور امن و انتظام قائم رکھے۔ اس وقت چونکہ عہد حاضر کے جیسے وسائل آمد و رفت اور رسل و سائل نہ تھے اس لئے حکومت کسی حد تک غیر مرکزی تھا مثلاً وہ محصولات (ٹیکس) جو کسی صوبے میں وصول ہوتے تھے اسی صوبے کی ضروریات پر خرچ کئے جاتے تھے اور جو فاضل رقم ہوتی تھی وہ مرکزی بیت المال کو بھیجی جاتی تھی۔ جب کسی صوبے کی آمدنی اُس کے خرچ سے کم ہوتی تھی تو یہ کمی مرکزی بیت المال سے پوری کیجاتی تھی۔

معاشرتی اور مذہبی تنظیمات

عرب کے زیادہ حصّے بدویوں سے آباد تھے جن کی معاشرتی اور حکومتی تنظیم قبائیلی تھی مگر بعض دوسرے حصّے ایسے بھی تھے جو معاشرتی اعتبار سے زیادہ ترقی کر گئے تھے اور ان کے طرز حکومت زیادہ ترقی یاب تھا۔

بدویوں میں ہر خیمہ ایک کنبہ تھا، خیموں کا ایک مجموعہ ایک خاندان تھا اور خاندانوں کا ایک مجموعہ ایک قبیلہ۔ بدویوں کی ذاتی چیزیں چند ہی ہوتی تھیں۔ وسائل آب رسانی، چراہ گاہ اور قابل کاشت زمینیں پورے قبیلے میں مشترک ہوتی تھیں اگرچہ خاندان بدویوں کی معاشرتی تنظیم کی بنیاد تھا۔ لیکن اسلام سے بہت قبل خاندان متحد ہو کر قبائل بن چکے تھے اور قبائل نے مل کر (ہر قبیلے کی خود مختاری برقرار رہنے کی شرط کے ساتھ) وفاق (کانفی ڈریسی) بنا لئے تھے۔

اسلام نے معاشرے کی صرف سیاسی تنظیم ہی میں تبدیلی نہیں کی بلکہ معاشرتی تنظیم میں بھی عظیم تغیرات کیے۔ یہ قبائل جو ہمیشہ برسرپیکار رہتے تھے ایک عظیم اعتقاد کے زیر اثر تیزی سے متحد ہو کر ایک قوم بن گئے۔

ظہور اسلام کے ساتھ عربوں کی قبائلی تنظیم، صحرائی علاقوں میں شیوخ کی منفرد فرمانروائی اور سرسبز علاقوں میں شاہوں اور سرداروں کی حکومتیں ختم ہوئیں اور ان کی جگہ ایک مرکزی حکومت قائم ہو گئی جس کا ایک ہی قانونی، اخلاقی، اور مذہبی ضابطہ سب کے لئے تھا۔ بدؤوں کی قدامت پسند، الگ تھلگ اور تتربتر سی ساکن و جامد سوسائٹی ایسی متاثر ہوئی کہ اس کی بنیادیں تک ہل گئیں۔ اس میں جہندگی پیدا ہو گئی اور وہ مائل بہ ترقی ہو گئی۔ خاندان جو اس کی بنیاد تھا اگرچہ بعض اعتبار سے پھر بھی قائم رہا، تاہم اس نے اس معاشرے کو جگہ دی جو ایسی مذہبی برادری پر مبنی تھا جس نے جغرافیائی حدود اور لسانی و نسلی اختلافات مٹا دیئے۔

عہد جاہلیت کی معاشرتی تنظیم میں بھی کنبہ ایک واحدے کی حیثیت سے موجود تھا لیکن اس کی واضح طور پر تعریف نہیں ہوئی تھی کہ اس کا دائرہ عمل کیا ہے اور اس کا خاص مقصد کیا ہے اور مرتبہ کیا ہے۔ تعدد ازدواج عام تھا۔ طلاق بھی بہت ہوتی تھیں اور شادی کا معاہدہ محض ایک روایتی رسم کے طور پر عمل میں آتا تھا۔ عرب سرداروں کے گھروں میں لونڈیاں بھی ہوتی تھیں۔ جب اسلام آیا تو اس نے ان معاشرتی مسائل کے لئے ایک وسیع اور معین ضابطہ دیا۔ کنبے کے لئے اس نے اعلان کر دیا کہ وہ معاشرے کا نہایت قابل احترام واحدہ ہے۔ تمام معاشرتی ترقیاں اس کی خدمت گزار قرار دی گئیں۔ مردوں اور عورتوں کے فرائض واعمال متعین کر دیئے گئے۔ شادی کو ایک عمل نیک سمجھا گیا۔ طلاق سے اس بنا پر نفرت کی گئی کہ وہ بہت ہی قابل اعتراض چیز ہے۔ تعدد ازدواج محدود کیا گیا،

عورتوں اور مردوں کے حقوق اور ذمہ داریاں صاف معین کی گئیں اور اس طرح ایک نیا معاشرتی نظام وجود میں آگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں اس معاشرتی نظام نے اعتدال، انسانیت اور اجتماعی انصاف کا ایک نرالا منظر پیش کیا۔

نئے معاشرے کے عناصر

اسلامی انقلاب سے جو نیا معاشرہ وجود میں آیا اس میں دو گروہ تھے۔ ایک مسلمان اور دوسرے غیر مسلم، یعنی مسلمانوں کے ساتھ یہودی، عیسائی اور دوسرے غیر مسلم اور غلام بھی شامل تھے۔ ان کے باہمی تعلقات، ان کا تدریجی تغیر اور پھر ان کے باہم مل جل کر ایک ہو جانے پر تبصرہ بڑا دلچسپ ہے۔

جماعت مسلمین کے مختلف گروہوں میں قطعی کوئی فرق نہ تھا۔ ذمہ داری کے عہدوں کے لئے مسلمانوں میں سے جو بھی کوئی لیا جاتا تھا وہ اپنے حسن سیرت قابلیت اور اسلام کے لئے جو خدمات اس نے انجام دی ہوتی تھیں انہی کی بنا پر لیا جاتا تھا۔ اگر مہاجرین کو امتیاز اور غلبہ حاصل تھا تو وہ اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ عرب اور قریش تھے بلکہ اس لئے تھا کہ وہ اسلامی انقلاب میں آگے آگے رہے اور انہوں نے اسلام کے لئے اور اس کے معتقدات کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور وہ اپنی جانیں اور اپنا مال سب خطرے میں ڈال کر اسلام کو کامیاب کرنے کی بڑی سے بڑی ذمہ داری لینے کو تیار تھے۔ چونکہ وہ ایسے تھے اسی لئے لوگوں نے انہی میں سے خلفاء کا انتخاب کیا اور ان کو اس مقام پر بٹھا دیا کہ وہ تمام امور (امت) کا انتظام و اہتمام کریں۔ ان خلفاء کا طرز عمل واقعی، دور حاضر کے بادشاہوں اور صدروں کا سا نہ تھا بلکہ وہ اپنے کو عوام کا خدمت گار اور لوگوں کے مفاد کا امین سمجھتے تھے۔ وہ اپنے فرائض

بڑے خیال سے اور وفاداری کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ اس دنیا کی زندگی میں ان کو کوئی لذت نہیں تھی، وہ نہایت تنگی سے بسر کرتے تھے۔

مسلمانوں میں دوسرا گروہ انصار تھے۔ انہوں نے بھی اسلام اور اس کے معتقدات کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ وہ یہی تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو اس وقت پناہ دی تھی جب وہ اپنا مولد چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ صرف پناہ ہی نہیں دی بلکہ ان کے پاس جو کچھ تھا، اس میں انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو شریک کر لیا۔ یہ انہی کی مدد سے ہو سکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار قریش کا خطرہ رفع کرنے کے لئے مدینے میں حکومت قائم کی۔ مہاجرین اور انصار دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتۂ اخوت میں منسلک کر دیا۔ ان انصار نے بھی مہاجرین ہی کی طرح اپنی زندگیاں اسلام کی حفاظت اور مقاصد اسلام کی ترقی کے لئے وقف کر دی تھیں اور مدینے کی ریاست قائم کرنے کے لئے اپنے بھائی مہاجرین کے ساتھ مل کر انہوں نے بھی عظیم قربانیاں کیں۔ اسی وجہ سے خلفائے راشدین کی مجلس شورے میں دونوں گروہوں کے ممتاز اشخاص شریک کر لئے گئے۔

اہمیت کے اعتبار سے موالی تیسرا گروہ تھے۔ موالی کی تنصیب غلامی کی تنصیب سے پیدا ہوئی۔ یہ قبل از اسلام موجود تھی۔ اسلام نے اسی کی اصلاح کی، اس کو وسعت دی اور بالآخر اسلام کے تحت عملی اور مذہبی تنصیب کی حیثیت سے اس کی منظوری دی گئی۔ قانون شریعت اور تاریخ میں ایک اصطلاح کی حیثیت سے اس کے تین مفہوم ہیں، آزاد کیا ہوا غلام، موالی از روئے معاہدہ، موالی، خون کے رشتے سے، موالی بجائے خود ایک تنصیب تھے، مسلمانوں کی آبادی میں ان کا بڑا حصہ تھا اور یہ بعد مولوں ہی میں نہیں بلکہ خود عرب میں موالی غیر عرب تھے جنہوں نے دوسرے ملکوں میں اسلام قبول کیا تھا اور ہجرت کر کے مدینے یا دوسرے مشہور شہر

مقامات میں آگئے تھے جیسے مکہ، طائف، کوفہ اور بصرہ۔ آزاد کردہ غلام بھی موالی کہلاتے تھے اور ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ موالی سلطنت اسلامی کے آزاد شہری تھے اور اس پر ان کا بڑا اثر تھا۔

خلفائے راشدین کے عہد میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق موالیوں کی حیثیت ایسی ہی اچھی تھی جیسی کسی دوسرے مسلمان کی۔ وہ دینی مدرسوں میں اساتذہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور علم کی اشاعت اور ترقی کی تمام ذمہ داری انہی پر تھی اور تحریر کا قریب قریب تمام کام وہی کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان موالیوں کے ساتھ بڑا منصفانہ معاملہ کیا گیا۔ اس کی بہت ہی نمایاں مثال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے بعد ایک مولا ہی کو خلیفہ نامزد کرنا چاہتے تھے اور حضرت علی رضؓ کے اکثر مولا ان کی فوج میں بڑے عہدوں پر مامور تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی سلطنت کی آبادی کا بڑا حصہ موالیوں پر مشتمل تھا اور وہ مرتبے میں عربوں کی برابر تھے اور واقعی کئی اعتبار سے بہتر۔ ابتدائی زمانے کی بہت سی فتوحات، جن میں عسکری بھی ہیں اور انتظامی بھی، عربوں کی قیادت میں انہی موالیوں کی ذہانت سے ہوئیں۔

غلام

اس نئے معاشرے میں غلام چوتھا گروہ تھے۔ اسلام سے قبل غلامی تمام اقوام کے نزدیک ایک تنصیب تھی۔ مگر اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ایسے اصول قائم کر دیئے کہ اگر ان کو صحیح روش پر ترقی دی جاتی تو غلامی بہت جلد ختم ہو جاتی۔ لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی جو ایک دن میں ہو جاتی۔ لہذا اس کی ضرورت تھی کہ غلاموں کے لئے ایسا انتظام کر دیا جائے کہ جب تک غلامی باقی رہے وہ اپنے آپ کو اچھا اور آزاد شہری بنا سکیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے غلامی کی تنسیخ کیلئے کوئی قطعی منشور جاری نہیں کیا اور اس خیال کی تائید میں عہد اولیٰ کے مسلمانوں کا طرز عمل بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بات صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے بلا کسی ابہام کے یہ اعلان کر دیا کہ آدمی آزاد ہے اور اس کو کسی دوسرے آدمی کی غلامی منظور نہ کرنی چاہیئے۔ اس کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ صرف خدا کو سجدہ کرے۔ یہ دعوے کیا گیا کہ تمام نسل انسانی بلاتمیز مذہب ایک برادری ہے۔ قرآن میں ایسی بہت سی آیتیں موجود ہیں جن میں مذکورہ بالا خیال کی تصدیق کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ "بنی نوع انسان ایک قوم تھے اور تیرے مالک نے یہ حکم دیا ہے کہ تو سوائے اللہ کے اور کسی کی پرستش نہ کر۔ اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے اس نے یہ حکم دے دیا ہے کہ سوائے اس کے اور تو کسی کی عبادت نہ کر[1]"

اب رہا واقعی غلامی کا مسئلہ تو بہتر یہ ہے کہ اس کے متعلق بغیر عذر و معذرت راست قرآن ہی کا قول تلاش کیا جائے۔ قرآن یہ اجازت نہیں دیتا کہ مسلم ریاست کی حدود کے اندر کسی شہری کو کسی وجہ سے بھی غلام بنایا جائے۔ وہ یہ بھی اجازت نہیں دیتا کہ کسی غیر ملک میں مسلم افواج شہریوں (یعنی غیر فوجی لوگوں) کو دق کریں گرفتار کریں یا غلام بنائیں۔ یہ صرف جنگ ہی میں ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مسلم ریاست میں غلام کی حیثیت سے داخل ہو۔ صرف اسیران جنگ ہی غلام بنائے جا سکتے ہیں ان اسیران جنگ کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ حکومت[2] ان کو قتل کر سکتی ہے، قید کر سکتی ہے اور فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ لئے آزاد کر سکتی ہے۔ یہ مختلف متبادل صورتیں تھیں جو سر دولت اسلامیہ حالات کے اعتبار سے اختیار کر سکتا تھا۔ خلفائے راشدین کے

---

[1] انِ الحکمُ الا للہ اَمَرَ اَلّا تعبدوا الّا ایاہ

[2] فاما منّاً بعد و اما فداءً حتیٰ تضع الحرب اوزارھا

عہد میں عملاً ان میں سے ہر صورت اختیار کی گئی۔ مگر زیادہ یہی ہوا کہ اسیرانِ جنگ مسلمان سپاہیوں میں غلام کی حیثیت سے تقسیم کر دیئے گئے۔ اس کی دو وجوہ تھیں اوّل یہ کہ اس کا اس زمانے میں کوئی انتظام نہیں تھا کہ اسیران جنگ کی کثیر تعداد کو جیل میں قید رکھا جاتا، اور دوسرے یہ کہ اگر اسیران جنگ افراد کے حوالے کر دیئے گئے تو ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے میں وہ اسلام قبول کر کے اچھے شہری بن جائیں۔ یہ دوسرا ہی سبب اس مسئلے کے فیصلے میں زیادہ اثرانداز ہوا۔ اسلامی تاریخ میں اس کی بڑی تابناک مثالیں ہیں کہ آزاد کئے ہوئے غلاموں نے اس کے بنانے اور ترقی دینے میں بڑا شاندار کام کیا۔ غلامی کی برائی رفع کرنے کی آخری تدبیر یہ تھی کہ غلاموں کی تقسیم کا معمول ترک کر دیا جاتا مگر یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ متحارب فریقوں پر یہ اعتماد کیا جا سکتا کہ وہ پھر جنگ شروع نہ کریں گے۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے یہ اقدام کیا کہ ان سب قیدیوں کو رہا کر دیا جو پیغمبری کے جھوٹے دعویداروں کے خلاف جنگوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ ان کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ ان مفتوحہ ملکوں میں انہوں نے اسیران جنگ کو رہا کر دیا جو مسلم حاکموں کی سیادت میں رہنے پر رضامند ہوئے۔ یہ غلام جو سپاہیوں میں تقسیم ہوتے تھے بالکل اپنے مالکوں کے اختیار میں ہوتے تھے مگر اکثر بہت جلد رہا کر دیئے جاتے تھے، اور رہائی کے باوجود اپنے آقاؤں سے وابستہ رہتے تھے اور ان کی غیر اور خارجی ثقافت اس نئے نظام میں حقیقی طاقت بنی۔ عظیم اسلامی انقلاب اور نئے معاشرتی قوانین کے باوجود ان خوفناک طاقتوں نے اپنی طبعی ترقی کے لئے الگ ایک راہ اختیار کر لی، اور بہت سی نئی روایات اور تنصیبات (انسٹی ٹیوشنیں) وجود میں آگئیں جن کی نہ توقع تھی اور نہ جو اس قابل تھیں کہ پسند کی جائیں۔ چونکہ غلام یکایک اسلام کے معاشرتی نظام میں داخل ہو گئے اور وہ بالکل اپنے آقاؤں کے دست نگر تھے،

فوراً ہی وہ ایک ایسا مسئلہ بن گئے جس کا کامل طور پر حل کرنا مشکل تھا۔

اگرچہ اس عہد میں غلامی بالکل منسوخ نہیں ہوئی لیکن غلاموں کے معاشرتی حالات کی اصلاح کے لئے بہت کچھ کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے غلامی کی رسم کو کم کرنے کیلئے مختلف طریقے پر کوشش کی اور جتنی غلامی باقی رہ گئی وہ اس قدر نرمی اور انسانیت کے ساتھ تھی کہ محض برائے نام۔ غلام عملاً اپنے آقاؤں کی برابر ہو گئے تھے۔

غلاموں کی آزادی کے لئے جو ہر قسم کی تدابیر اختیار کی گئیں ان میں بہت ہی مشہور یہ تھی کہ غلاموں کو بربنائے رحم و کرم رہا کیا جائے۔ مسلمانوں کو یہ ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ غلاموں کو رہا کریں اور اس کے مختلف مواقع تھے۔ مثلاً کفارۂ گناہ کے لئے کسی احسان کے شکریئے میں یا کسی خدمت کے عوض۔ شادی، بچوں کی پیدائش اور ایسے ہی دوسرے مواقع پر بھی غلام رہا کیئے جاتے تھے۔ غلام اور آقا کے درمیان باضابطہ معاہدے کے ذریعے بھی غلام رہا ہوتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ غلام یہ وعدہ کرتا تھا کہ وہ اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر کوئی معینہ رقم باقساط ادا کرے گا۔ اس کو مکاتبہ کہتے تھے۔ وہ غلام جو اپنا فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے ان کو زکواۃ کے فنڈ سے رہا کیا جاتا تھا۔ زکواۃ کے خرچ میں یہ ایک خاص مد تھی۔

جب کوئی آقا اپنی کنیز کو اپنی بیوی بناتا اور اس کے بطن سے بچہ ہوتا تو اس آقا پر یہ واجب ہو جاتا کہ اس کا احترام کرے۔ پھر وہ اس کو کنیز کے طور پر فروخت نہیں کر سکتا تھا اور اس کی وفات پر وہ یونہی آزاد ہو جاتی تھی۔ نیز وہ بچے جو اس طرح کنیزوں سے پیدا ہوتے آزاد شہری ہوتے تھے اور اسی طرح ترکے کے مستحق جیسے آزاد بیویوں کے بچے۔

جو لوگ پہلے سے غلام تھے ان کے لئے حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے آقاؤں کے ہم مرتبہ ہو گئے۔ جب بدر اور دوسرے غزوات کے مجاہدوں کے لئے انہوں نے وظائف مقرر کئے تو غلاموں کو ان کے آقاؤں کے برابر ہی دئے۔ کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ کھانے، پہننے اور بچوں کی تربیت کے معاملے میں غلاموں کے ساتھ برابر کا برتاؤ کریں۔ اپنے عہدہ داروں کو حضرت عمرؓ کی یہ ہدایت بھی تھی کہ اگر غلام بیمار ہوں تو ان کی عیادت کو جائیں۔ اگر ان میں سے کوئی اس ہدایت کی تعمیل سے قاصر رہا تو بعض اوقات اس قصور پر وہ برخاست بھی کیا گیا۔ حضرت عمرؓ غلاموں کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دیتے تھے، اور حاضرین کے سنانے کے لئے یہ باواز بلند فرماتے تھے کہ خدا کی لعنت ہو ان لوگوں پر جو غلاموں سے ملنے جلنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ افواج کے سالاروں کو یہ ہدایت تھی کہ اگر کسی شخص کو غلام پناہ دے دے تو سمجھنا چاہیئے کہ تمام مسلمانوں نے پناہ دے دی اور فوج کو اس کی پابندی کرنی چاہیئے۔ ایک سالار فوج کو انہوں نے لکھا۔ "کسی مسلمان کا کوئی غلام مسلمانوں ہی میں سے ایک ہے۔ جو پناہ وہ دیتا ہے وہ مسلمانوں کی طرف سے پناہ ہے اور اس کی پابندی ہونی چاہیئے۔"

غلاموں اور ان کے بیٹوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا تھا اس میں اس قدر شرافت و آدمیت تھی کہ اسی کے باعث غلاموں میں سے بڑے بڑے طباع پیدا ہوئے جن کا پوری سلطنت اسلامیہ میں احترام کیا جاتا تھا۔ مثلاً اسامہ ان افواج کے پہلے کماندار تھے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جہاد کے لئے بھیجیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام بڑے صحابہ حضرت اسامہ رضؓ کی ماتحتی میں تھے۔

عکرمہ حدیث کے اماموں میں سے ہیں۔ عبداللہ بن عباس نے ان کو

مفتی کی سند دی تھی اور ثانی امام مالک کے استاد تھے اور ان کا سلسلہ محدثین سلسلۃ الذہب مشہور ہے۔

غلاموں کی شادی

اسلام سے قبل کنیزیں یا اپنے آقاؤں کی ہوس نفسانی کے لئے ہوتی تھیں، جن کے کوئی حقوق نہیں تھے یا کسبیوں کی حیثیت سے روپیہ کما کر اپنے آقاؤں کو دیتی تھیں۔ یہ دونوں بداعمالیاں فوراً منسوخ کی گئیں اور یہ حکم دیا گیا کہ آزاد اور غلام دونوں شادیاں کریں :۔ وانکحو الایامیٰ منکم والصٰلحین من عبادکم وامآئکم

اس حکم کے ساتھ کہ غلام مرد ہوں یا عورتیں، شادی کر کے رہیں۔ کنیزوں سے پیشہ کرانے کی ممانعت کی گئی اور اس طرح اس ایک حکم سے کہ ان کی شادی کی جائے، ان دو برائیوں کا خاتمہ ہوگیا جو اسلام سے قبل عرب میں عام تھیں۔

سچ ہے، آقا کو اب بھی یہ اختیار تھا کہ کنیز کے ساتھ نفسانی تعلقات قائم کرے لیکن اس کے ساتھ اتنی شرائط عائد کر دی گئیں کہ کنیزوں کا کام بتہ قریب قریب وہی ہوگیا جو آزاد بیویوں کا تھا۔ اس کے حقوق معین ہو گئے۔ اس کا بیٹا خلیفہ تک ہو سکتا تھا۔ ان بہت سے مسلمان خلفاء میں جو کنیزوں کے بطن سے پیدا ہوئے مامون جیسا عظیم عباسی خلیفہ بھی تھا۔

اس آقا کا معاملہ جو خود اپنی کنیز سے جنسی تعلقات رکھنا چاہے صرف ایک اس بات میں مختلف تھا کہ آقا ہونے کی وجہ سے اس کو کسی دوسرے کی اجازت درکار نہیں تھی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب اسیر جنگ کو بیوی بننے کی عزت دی تو اس کو آزاد بھی کر دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ایسی خواتین کو جو اسیر جنگ تھیں اسی طریقے پر اپنی زوجیت میں لیا۔ اس طرح آپ نے مسلمانوں کے لئے اس معاملہ میں مثال قائم فرمائی اور مسلمان اس پر مامور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کریں، نہیں بلکہ آپ کا یہ طرز عمل قرآن کے ان معنے پر مبنی تھا جو آپ نے سمجھے۔ قرآن کے جن معنے کا ثبوت آپ کے عمل سے ثابت ہو لازماً تمام مسلمانوں کو انہی معنے کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت پرزور طریقے پر یہ طے کر دیا کہ کنیز کے آقا کو چاہیئے کہ اس کو تعلیم دے اس کو آزاد کر دے اور اس سے نکاح کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

عن ابی موسیٰؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثة لھم اجران، رجل من اھل الکتاب اٰمن بنبیه واٰمن بمحمد (صلی اللہ علیہ وسلم) والعبد المملوک اذا ادّی حق اللہ تعالیٰ وحق موالیه، ورجل کانت عندہ امة یطؤھا فادّبھا فاحسن تادیبھا وعلّمھا فاحسن تعلیمھا ثم اعتقھا فتزوّجھا فله اجران

(بخاری کتاب العلم)

تین آدمی ہیں جن کا اجر دگنا ہے وہ شخص جو اہل کتاب ہے۔ اپنے پیغمبر پر ایمان رکھتا ہے اور محمدؐ پر ایمان رکھتا ہے اور وہ غلام جو دوسرے کی ملک ہے، اپنے وہ فرائض انجام دیتا ہے جو اس کے آقا کے حق میں اس پر عائد ہیں۔ اور وہ آدمی جس کے پاس کنیز ہے اور وہ اس کو تمیز سکھاتا ہے شائستہ اطوار کی تربیت کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے اور پھر آزاد کرتا ہے اور اس سے نکاح کرتا ہے۔

جو لوگ اس کے خلاف ہیں انہوں نے اس پر بڑی نکتہ چینی کی ہے، اور

اس کو انہوں نے داشتہ عورتوں کے ساتھ نفس پرستی قرار دیا ہے، جو واقعی یہ نہیں ہے۔ یہ نکتہ چین اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان حالات کے اندر جو اس وقت ساری دنیا میں تھے اسلام کا کنیزوں کو یہ حق دینا اس حقیقت پسندانہ روش کے مطابق تھا جو اس نے تمام مسائل میں اختیار کی ہے وہ لوگ جو اس سے واقف ہیں کہ عہد حاضر کی جنگوں کے بعد کیا ہوتا ہے وہ اسلام کے اس حقیقت پسندانہ حل کی تعریف کریں گے۔

اب صرف ان نئی ماتحت نسلوں کے متعلق کہنا رہ گیا ہے جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی پیرو تھیں اور جنکو ہم نے شہریوں کی دوسری فہرست میں رکھا ہے جو خلافت کے ماتحت پانچواں بڑا گروہ تھا۔

خلافت چونکہ اعتقادی ریاست تھی اس لئے انتظامی امور صرف انہی لوگوں کے سپرد کئے جا سکتے تھے جن کا ان معتقدات پر کامل ایمان تھا اور اس کی اسپرٹ سے واقف تھے اور اسی ریاست کے مقاصد کی تکمیل کو اپنا نصب العین بنا چکے تھے۔ یہ صرف مسلمان ہی تھے جنہوں نے ہر قسم کی قربانیاں کی تھیں اور یہ عہد کیا تھا کہ ریاست کو چلانے کی تمام ذمہ داریاں برداشت کریں گے اور ذمی صرف اس پر راضی ہوئے تھے کہ حدود ریاست کے اندر امن و سکون کے ساتھ ذمی کی حیثیت سے رہیں گے ایک ایسے فریق کے حقوق اور ذمہ داریاں خواہ مخواہ مختلف ہوں گی اور بنیادی اعتبار سے چونکہ غیر مسلم ریاست کے معتقدات کے قائل نہیں تھے اس لئے نہ وہ اس کے اساسی انتظام میں شریک کئے جا سکتے تھے اور نہ ان کو کلیدی عہدے دئے جا سکتے تھے۔ پھر بھی خلافت قرآن کی اس آیتہ کے مطابق : لا اکراہ فی الدین "دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں" اس کی قائل نہیں تھی کہ دوسروں کو زبردستی اپنا کلچر، مذہب اور روایات

قبول کرنے پر مجبور کرے اور نیشنلزم کے لباس میں غیر مسلموں کی ثقافت کو مسلمانوں کی ثقافت میں جذب کرنے کے لئے جابرانہ تدابیر اختیار کرے یا قوانین بنائے۔ اس نے غیر مسلموں کو اپنی ثقافت کی ترقی اور اپنے مذہبی قانون کے مطابق اپنے ذاتی معاملات طے کرنے کا پورا موقع دیا۔ نہیں وہ اس سے بھی آگے بڑھی اور تمام غیر مسلموں کو خلافت نے اپنی ذمہ داری قرار دیا اور اس حیثیت سے ان کے لئے آزادیٔ ضمیر و مذہب اور حفاظت جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی

چونکہ غیر مسلموں کے ذمہ ریاست کے دفاع کے لئے لڑنا نہ تھا۔ اس لئے ان کو ایک چھوٹا سا ٹیکس دینا ہوتا تھا جسے جزیہ کہتے ہیں لیکن جب وہ فوجی خدمت کے لئے آمادہ ہوتے تھے تو فوراً ان کو جزیے سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت کہ جزیہ صرف فوجی خدمت کے استثنیٰ کا بدل تھا یہ ہے کہ جزیہ صرف انہی سے لیا جاتا تھا جو فوجی خدمت کر سکتے تھے۔ چنانچہ عورتوں سے، بوڑھوں سے، بچوں سے، بیماروں اور اپاہجوں سے جزیے کا مطالبہ ہی نہ تھا۔ وہ اس سے قطعی مستثنیٰ تھے مگر دوسری طرف صورت یہ تھی کہ کسی مسلمان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ فوجی خدمت سے کسی طرح استثنیٰ حاصل کر سکے۔

یہ بات بڑی معنے خیز ہے اور اس لئے قابل لحاظ کہ مفتوحہ ممالک کی تمام زمینیں، غیر مسلموں کے لئے چھوڑ دی گئی تھیں اور ان کو ملکیت و انتظام کے تمام اختیارات دئے گئے تھے۔ مسلمان کسی حالت میں غیر مسلم سے زمین نہیں خرید سکتا تھا۔ حتیٰ کہ حکومت بھی بغیر مالک کی مرضی کے اپنی ضرورت کے لئے یہ زمین نہیں لے سکتی تھی۔ حکومت نے ان زمینوں کی جو مالگزاری مقرر کی تھی وہ نہایت منصفانہ تھی اور جنس کی صورت میں ہرگز زمین کی پیداوار کے نصف سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے تحصیلداران مالگزاری کو یہ ہدایات جاری کر دی تھیں

کہ غیر مسلموں کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آئیں اور معمولاً ہر صوبے کے دس آدمی یہ شہادت دینے کے لئے طلب کرتے تھے کہ کاشتکار یعنی غیر مسلم کے لئے کافی چھوڑ دیا گیا ہے۔

عدل و انصاف کے معاملے میں مسلم اور غیر مسلم برابر تھے۔ اگر کوئی غیر مسلم مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تو وہ مسلمان قاتل غیر مسلم کے ورثا کے حوالے کر دیا جاتا، تاکہ وہ اس سے انتقام لیں۔ غیر مسلموں کے دیوانی مقدمات ان کی اپنی عدالتوں میں اپنے قانون کے مطابق طے ہوتے تھے۔ یہ عدالتیں بالکل مذہبی ہوتی تھیں۔ گرجوں کے بڑے پادری جج کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ تاہم غیر مسلموں کے لئے اس کی ممانعت نہیں تھی کہ مسلم عدالتوں میں انصاف حاصل کریں۔ البتہ حکومت ذمیوں کو اس پر مجبور نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنے دیوانی مقدمات قاضی سے طے کرائیں۔ لیکن اگر غیر مسلم اپنی مرضی سے ایک مرتبہ مقدمہ لے جاتا تھا تو اسلامی قانون کے مطابق کاروائی ہوتی تھی اور غیر مسلم کو اس کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔

مسلمان حکام کو یہ اجازت نہیں تھی کہ غیر مسلموں کے قانون وراثت میں دخل دیں۔ کوئی عیسائی یا یہودی مسلمان سے ترکہ نہیں پا سکتا تھا اور نہ کوئی مسلمان عیسائی یا یہودی سے۔

مسلم حکومت نے مزید اس کی ضمانت بھی کر دی تھی کہ زیر حفاظت مذاہب کے درمیان تصادم نہ ہو، نہ کوئی عیسائی یہودی ہو سکتا تھا اور نہ یہودی عیسائی اگر کوئی ذمی یہ وصیت کرتا کہ اس کے ترکے سے مسجد بنائی جائے تو اس کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اگر وہ اپنے مذہب کی عبادت گاہ بنانے کی وصیت کرتا تو اس کی اجازت تھی۔ لاوارث ذمی کا مال اس کے فرقے کے لوگوں کو ملتا تھا، اور

لاوارث مسلمان کا مال بیت المال میں جاتا تھا۔

ضمیر کی آزادی

خلافت نے زیر حفاظت رعایا (ذمی) کی عبادت میں کبھی مداخلت نہیں کی ہر فرقے کے لوگوں کو خواہ ان کا کوئی مذہب تھا اپنا مذہبی پیشوا مقرر کرنے کی اجازت تھی۔ عیسائیوں کو اجازت تھی کہ اپنے قدیم گرجوں کی مرمت کریں اور اس کی بھی کہ نئے بنائیں۔ لیکن جو شہر مسلمانوں نے تعمیر کئے تھے، صرف ان میں ان کو نئے گرجے بنانے کی اجازت نہیں تھی۔

مسلم روایات اس پر شدت سے مصر ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا جائے یا کم از کم منصفانہ ضرور۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر کوئی ایسے شخص پر ظلم کرتا ہے جس کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے یا استطاعت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالتا ہے میں قیامت کے روز اس کے خلاف وکالت کروں گا"[1]

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اگر کوئی صوبہ یا قوم تمہارا خیر مقدم کرے اس سے معاہدہ کرو اور اس کے ساتھ اپنے وعدے کی پابندی کرو، ان کو اپنے قوانین کے مطابق بسر کرنے دو اور اپنے رسوم و رواج قائم کرنے کی اجازت دو اور اس سے وہ محصول لے لو جو تمہارے اور اس کے درمیان طے ہو گیا ہو۔ اس کو اپنے مذہب پر اور اپنی زمین میں رہنے دو۔"[2]

حضرت عمرؓ نے ان کے ساتھ بڑی مہربانی اور انصاف کا برتاؤ کیا۔ جب وہ ان پر مالگزاری عائد کرتے تھے تو اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ ان کی گذر بسر

---

[1]

[2]

کے لئے کافی چھوڑ دیا گیا۔ وہ اپنی موت کے وقت تک ان کو نہیں بھولے۔
اپنے جانشین کے لئے انہوں نے یہ ہدایات چھوڑیں کہ وہ ان کے ساتھ انصاف
کریں، جو معاہدہ ان کے ساتھ ہوا ہے وہ قائم رکھیں اور ان پر محصولات کا
زیادہ بار نہ ڈالیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے ان خلفاؑ
کی ہدایات تھیں جنہوں نے اپنے آقا و مولا کے تصورات کو واقعی عملی صورت
دی ہے۔

اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کے جن لوگوں نے اسلام
قبول کیا ان کو فوراً عرب مسلمانوں کے برابر حقوق مل گئے اور وہ حاکم طبقے کی
صف میں شامل ہو گئے۔ جن کے کندھوں پر جتنا زیادہ سخت بار تھا اتنا ہی زیادہ
ان کے لئے یہ کلمہ دلکش تھا! لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہؐ اس نے انکو فوراً
غلامی اور اس عہد کے خطرات سے آزاد کر دیا۔ اس طرح عراق، شام، مصر، فارس
اور دوسرے مفتوحہ ممالک میں بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

وہ لوگ جو مختلف قبائل میں منقسم تھے، مشترکہ مذہب اسلام کے اثر سے
ایک متحدہ قوم بن گئے۔ عرب کی قدیم روایات میں نسبی شرافت پر بڑا زور تھا اسلام
نے بالکل اس کے خلاف کیا۔ اس نے صرف تمام مومنوں کو بھائی ہی قرار نہیں دیا،
بلکہ خاندانی شرف اور قبائلی عصبیت کی شدت سے مذمت کی۔ ذیل میں ایک
پرانے قصیدے کے اشعار کا مفہوم درج ہے۔

مختصر یہ ہے کہ خلافت راشدہ اجتماعی تنظیم کا ایک حیرت انگیز اور نرالا تجربہ تھی۔ یہ تجربہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیا لیکن یہ اس نئے نظام کی صورت میں پھولا اور پھلا جو آپ کے بعد تمام دنیا پر چھا گیا۔ دوسرے ملکوں کے لوگ جو راست اسلام کی حکومت کے تحت آئے، ان میں تو یہ نئی اسپرٹ پیدا ہونی ہی تھی جو ہوئی اور وہ اسلام کے عجائبات اور نفاستوں میں شریک ہوئے، لیکن اس دائرے کے باہر جو دنیا رہی اس پر بھی اسلام کا گہرا اثر پڑا اور اس نے اس سے اتنا سیکھا کہ بنی نوع انسان کی حالت سنور گئی۔

مذہبی تنصیبات

اس زمانے میں انتظام کے ساتھ تبلیغی سرگرمیوں کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ہر مسلمان میں یہ جوش بدرجہ اتم موجود تھا کہ دوسروں تک اسلام کا پیغام پہنچائے اسلام کی تبلیغ کے لئے خلفائے راشدین نے مسلمانوں کے اور خصوصاً مجاہدوں کے مثالی طرز عمل پر اعتماد کیا۔ اس لئے انہوں نے اسلام کے سپاہیوں کو بڑی تفصیل سے یہ اخلاقی ہدایات بھیجیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں ایسا طرز عمل اختیار کریں جو خوش اخلاقی کا بہترین نمونہ ہو۔

حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت اسامہ کو جو ہدایات دی تھیں وہ خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔ ایسی ہی ہدایات دوسرے خلفائے راشدین نے بھی وقتاً فوقتاً صادر کیں۔ یہ مسلمان سپاہیوں کے غیر معمولی اخلاقی طرز عمل، ان کی حق پروری، غریبوں اور مظلوموں کے حق میں ان کی ہمدردی اور سب سے زیادہ مفتوحین، گرے ہوؤں

اور غلاموں کے ساتھ ان کے فیاضانہ اور نرم سلوک سے ہوا کہ کروروں انسان ان کے مذہب اور اس نئے نظام کی تعریف کرنے لگے جس کے یہ نمائندے تھے۔ مگر پھر بھی بعض مذہبی تنبیہات تھیں جن میں سب سے زیادہ اہم مسجد تھی۔ چونکہ مذہب ریاست کے دوسرے کاموں سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے ایک ہی شخص دونوں جگہ حاکم اور منتظم خاص تھا اور وہی عمارت جو مسجد تھی سیاست اور مذہب دونوں کا مرکز تھی۔

اسی تعلق کی وجہ سے مسجد چھاؤنی کے وسط میں رکھی جاتی تھی اور فرمانروا کے رہنے کا مکان اس کے متصل تعمیر ہوتا تھا۔ مسجد صرف اسی کے لئے مذہبی مرکز نہیں ہوتی تھی کہ اس میں نماز باجماعت ادا کی جائے بلکہ اسلام کا یہ مقصد پورا کرنے کے لئے بھی کہ اخوت اور مساوات کی بنا پر مسلمانوں کا معاشرتی نظام وجود میں آئے جس میں لیڈر کی اطاعت کے ساتھ نکتہ چینی کی آزادی ہو، اور مسلم جماعت کے تمام عناصر کے درمیان پورا اجتماعی انصاف۔ اوّل تو ایک محلے کے تمام لوگوں کا دن میں پانچ وقت جمع ہونا ہی ایسا ہے کہ اس سے نہایت اچھے معاشرتی تعلقات پیدا ہوتے ہیں لیکن جمعہ کی نماز میں اس کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ عیدین کی نمازیں اس سے زیادہ اور حج میں تو دنیا کے ہر حصے کے لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کی نماز باجماعت سے جماعت مسلمین کے مختلف عناصر کے درمیان معاشرتی تعلقات میں ترقی ہوتی ہے۔

مگر سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ نماز باجماعت سے (وہ) معاشرتی فرق (جو لوگوں کے درمیان ان کے ذاتی حالات کی وجہ سے ہوتا ہے)، ہموار ہو جاتا ہے۔ مسجد کے دروازے میں داخل ہوتے ہی ہر مسلمان مساوات اور محبت کے ماحول میں ہوتا ہے اپنے خالق کے حضور میں سب شانہ بشانہ کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہ اپنی مفلس

زین رعایا کے برابر، امیر اپنے زرق برق لباس میں اس فقیر کے برابر جس کے تن پر چیتھڑے ہوتے ہیں اور کالا گورے کے برابر۔ نہیں اس سے زیادہ یہ ہے کہ آقا پچھلی صف میں ہوتا ہے اور نوکر یا فقیر اگلی صف میں اور جب وہ سجدے میں جاتا ہے تو آقا کا سر نوکر کے قدموں میں ہوتا ہے۔ بلند و پست کو ہموار کرنے میں اس سے زیادہ بڑا اثر دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

نسل، دولت اور رنگ کے اختلافات مسجد میں مٹ جاتے ہیں اس کی چہار دیواری کے اندر ساری دنیا سے مختلف ماحول ہوتا ہے۔ یہی مساوات اخوت اور محبت کا سبق جب روز مرّہ کی زندگی میں عمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو نوع انسانی کے درمیان ایسے ہی تعلقات کی بنیاد بن جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دوسرے مقاصد کے علاوہ روز کی پنجگانہ نماز کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اخوت، مساوات اور اجتماعی انصاف کی اصولی تعلیم کو جس کا اسلام حامی ہے، عملاً برتا جائے۔ ان کی کتنی ہی زبانی تبلیغ ہوتی مگر وہ عملی اثر مرتب نہیں ہو سکتا جو نماز باجماعت کی ترتیب سے ہوا۔

سیاسی اور مذہبی کے علاوہ مسجد ثقافتی مرکز بھی تھی۔ یہاں مسلمانوں کو ان کی خوشحالی کے تمام مسائل کی تربیت دی جاتی تھی۔ جمعہ کا خطبہ ان مسائل پر ایک مستقل وعظ ہوتا تھا۔ مزید براں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کو کسی اہم بات کی اطلاع دینی ہوتی تھی تو مسجد میں اس پر خطبہ دیا جاتا تھا۔

عوامی پیمانے پر اس تعلیم کے علاوہ جو مسجد نبوی میں ہوتی تھی ان لوگوں کی خصوصی تعلیم کا بھی انتظام تھا جو علم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جن لوگوں کو بعید مقامات میں اسلام کی تبلیغ اور علم کی روشنی پھیلانے کے لئے تربیت دی جاتی تھی وہ مسجد

تعلیم ہی نہیں پاتے تھے بلکہ ان کے قیام و طعام کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور خلفائے راشدین کے عہد میں مسجد ہر قسم کی مسلم سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ تمام بڑے قومی مسائل وہیں طے ہوتے تھے۔ جب مسلمان جہاد کرنے پر مجبور ہوئے تو وہ مسجد ہی تھی جہاں مدافعت اور مہمات بھیجنے کے مسائل پر اتفاق رائے ہوتا تھا۔ جو اہم خبریں آتی تھیں وہ بھی مسجد ہی میں لوگوں کو سنائی جاتی تھیں۔ مسجد کونسل ہال یا (دار الشوریٰ) کا کام بھی دیتی تھی۔ حضرت عمر رضؓ کے زمانہ خلافت میں جب خلیفہ کو مشورہ دینے کے لئے دو مشیر مقرر کئے گئے تو یہ مشیر مسجد ہی میں مجتمع ہوتے تھے۔ مسلم اور غیر مسلم قبائل کے وفود سے مسجد ہی میں ملاقات کی جاتی تھی۔

خلیفہ نماز کے لئے اور جماعت مسلمین کی رہنمائی کے لئے مقرر کیا ہوا امام اور خطیب ہوتا تھا۔ ریاست و حکومت کے امور میں مسجد کی جو معنویت تھی اس کی نمود منبر تھا۔ خلیفہ کے تقرر میں یہ بات شامل تھی کہ وہ اپنی حاکمانہ حیثیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست پر بیٹھے۔

جب حضرت ابوبکر رضؓ سے ان لوگوں نے بیعت کی جنہوں نے ان کو خلیفہ رسول منتخب کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو حضرت ابوبکر رضؓ ممبر پر بیٹھے۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے خطبہ دیا اور لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی اختیار کی۔ یہی دوسرے خلفاء کے لئے بھی ہوا۔

اللہ اور رسول کی تعریف کے بعد خطبے میں سابق خلیفہ کا ذکر ہوتا تھا اور اس کے بعد نیا خلیفہ باضابطہ اپنا تعارف کرتا تھا۔ اگر خلیفہ کے خلاف کوئی شکایت ہوتی تو مسجد ہی میں لوگ وہ شکایت بھی ظاہر کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضؓ کے خلاف جو بغاوت ہوئی تھی وہ بھی مسجد نبوی ہی سے شروع ہوئی۔ جس وقت وہ خطبہ

دے رہے تھے تو لوگوں نے ان پر پتھر پھینکے۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا انتخاب بھی مسجد ہی میں ہوا تھا۔ مسجد شورے کے تمام جلسے مسجد میں ہوتے تھے اور خلفائے راشدین کے عہد میں خلافت کے تمام انتظامی امور کا نفاذ مسجد سے ہوتا تھا۔ خلیفہ خصوصیت کے ساتھ ممبر ہی سے تقریر کرتا تھا۔ اور وہ حج کو جاتا تھا تو مکے اور مدینے کی مسجدوں کے ممبروں سے تقریر کرتا تھا۔

صوبوں میں گورنر کا ممبر سے وہی تعلق تھا جو دارالخلافت میں خلیفہ کا۔ ممبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنا ایک حق تھا جو خلیفہ صوبوں کے لئے والیوں کو منتقل کر دیتا تھا اور والی خلیفہ ہی کے نام سے خطبے دیتے تھے۔ خلیفہ کی طرح والی بھی اپنے عہدے پر اسی طرح آتا تھا کہ ممبر پر کھڑا ہو کر خطبہ دے۔ یہ اختیار و اقتدار کی ایک علامت تھی۔ اللہ کی تعریف اور رسولؐ پر درود و سلام کے بعد وہ اپنے تقرر کا اعلان کرتا تھا یا خلیفہ کی طرف سے اس کو جو تقرر نامہ ملتا تھا اسے پڑھتا تھا اور بقیہ خطبے میں مذہبی اور دنیوی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔

مسجد ہی عدالت انصاف تھی۔ خلیفہ کے مقرر کئے ہوئے قاضی مختلف مساجد میں عدالتی مقدمات فیصل کرتے تھے۔ اس طرح مسجد حقیقی اور جامع مفہوم میں مسلمانوں کا قومی مرکز تھی جس میں عبادت بھی کی جاتی تھی اور تمام سیاسی تعلیمی اور معاشرتی مسائل کا انصرام بھی ہوتا تھا اس لئے تمام سلطنت میں بڑی بڑی خوبصورت مسجدیں تعمیر ہوئیں اور ان کی داشت کے لئے مناسب انتظامات کئے گئے۔ حضرت عمرؓ ہی کے عہد خلافت میں صرف حدود عرب کے اندر ۴۰۰ سو مسجدیں تعمیر ہوئیں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لحاظ سے کعبے کے صحن وسیع کئے گئے۔

اسی زمانے میں قرآن کو یکجا مرتب کر کے اس کے معیاری نسخے شائع کئے گئے

ملک کے بڑے مرکزوں میں ممتاز قاری بھیجے گئے تاکہ لوگوں کو صحیح قرآن پڑھنا سکھائیں۔ ہر مسجد میں مدرسہ قائم کیا گیا۔ قرآن کی تعلیم مقدم قرار پائی۔ اس کے بعد فقہ کا درجہ تھا۔ جس طرح قرآن کی تعلیم کے لئے قاری بھیجے گئے اسی طرح فقہ کی تعلیم کے لئے فقیہہ بھیجے گئے۔ ان فقیہوں کو حکومت سے تنخواہ ملتی تھی جس طرح دیندار مستند فقیہہ فتوے دے سکتے تھے اس طرح مستند ہی فقیہوں کو فقہ کی تعلیم دینے کی اجازت تھی۔

حج، زکواۃ اور روزے کی تنظیمات کا ذکر باب اول میں گزر چکا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے خاص کی وفات اور حالات میں تبدیلی کی وجہ سے بعض وہ تنظیمات جو اچھی طرح سے قائم ہو چکی تھیں ان میں اموی خلافت کے دوران نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں اور خلفائے راشدین کے عہد میں مثالی اسلامی ریاست کا جو معیار قائم کیا گیا تھا اس سے گر گئیں۔

باب ۴

اسلامی تنصیبات تحت خلافت بنی امیہ

خلفائے بنی امیہ کی آمد کے ساتھ خلافت کا انتخابی پہلو ختم ہو گیا۔ انہوں نے اپنا جانشین خاندانی وراثت کی بنا پر نامزد کرنا شروع کیا۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت خاندان بنی امیہ کے اندر محدود ہو گئی۔ اب ہم تاریخی تنقید کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس وقت کے متغیر حالات میں نامزدگی کس طریقے سے بچکر کیا اس سے کوئی بہتر متبادل طریقہ اختیار کیا جا سکتا تھا؟ تاریخ کا یہ ثابت شدہ واقعہ ہے کہ تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جماعت مسلمین کا اتحاد و یکجہتی درہم برہم ہو گئی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ خلیفہ کی عالمگیر حیثیت جاتی رہی تھی۔ ان حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ خلیفہ کے انتخاب کے دائرے کی وسعت پورے قبیلہ قریش تک قائم رکھی جاتی یہ ضروری ہو گیا تھا کہ خلیفہ کا انتخاب قبیلہ کی دو اہم شاخوں میں سے ہو۔ یعنی یا بنو امیہ میں سے یا بنو ہاشم سے۔ اس وقت

چونکہ اختیار بنی امیہ کے ہاتھ میں تھا اس لئے یہ بالکل طبعی بات تھی کہ خلافت کا انتخاب اس وقت تک کے لئے اس خاندان میں محدود ہو جائے جب تک کہ اختیار اس سے نہ چھینا جائے۔ لیکن پھر بھی اس موروثی جانشینی سے بچنا ہی چاہیئے تھا جس سے جانشینوں میں پستی اور انحطاط واقع ہوتا ہے اور یہ کرنا چاہیئے تھا کہ خلیفہ کسی مجلس شوریٰ کا تقرر کرتا اور وہ امویوں ہی میں سے کسی بہتر شخص کو خلیفہ منتخب کرتی۔ یہ طرز حکومت جو خاندانی دعووں کی بنا پر تھا اس طرح بھی خوبی سے چل سکتا تھا جس طرح عہد حاضر میں جمہوری حکومتیں سیاسی پارٹیوں کی روش پر چلتی ہیں۔ یہ نہیں کیا گیا اور اس خاندان کے پہلے فرمانروا امیر معاویہ جنہوں نے اپنے نالائق بیٹے یزید کو اس عظیم عہدۂ خلافت کے لئے نامزد کیا جس میں ریاست کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے امور کا انصرام مجتمع تھا، اس جائز نکتہ چینی سے نہیں بچ سکے کہ انہوں نے اسلام میں وراثتی طریقۂ جانشینی داخل کردیا۔

حضرت امیر معاویہ کی اس دوہری سیاسی غلطی نے پوری امت اسلامیہ کے دلوں میں ایک تبدیلی کا جذبہ پیدا کیا جو حادثۂ کربلا کا باعث ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسینؓ اور اپنے پورے خاندان کے ساتھ یزید کی افواج کے ہاتھوں سے شہید ہوئے۔ اسی حادثے اور دوسرے عوامل کی وجہ سے خلافت بنو امیہ کا جلد سقوط واقع ہوا۔

حالات اس وجہ سے اور بھی ابتر ہوئے کہ فرزند اکبر کی توریث کے عام قانون کے مطابق بھی وراثتی جانشینی کا طریقہ نافذ نہیں کیا جا سکا اس کا سبب یہ ہوا کہ اس کی اجازت نہیں تھی کہ خلیفہ کا جانشین نابالغ بیٹا ہو۔ ان حالات میں اکثر یہ ہوا کہ خلیفہ کے بھائی کو جانشینی کے لئے مقدم قرار دیا جاتا تھا اور بیٹے کو درجہ دوم میں۔ بیک وقت دو دو ولی عہدوں کی نامزدگی سے بعد میں بڑی تباہیاں

واقع ہوئیں۔

بیعت

بہرکیف خلیفہ کی زندگی ہی میں نامزد ولیعہد کے لئے لوگوں سے بیعت لی جاتی تھی اور جب ولی عہد مسند خلافت پر بیٹھتا تھا تو اس بیعت کی تجدید ہوتی تھی۔ خلیفہ کا عہدہ خلافت اختیار کرنا اب بھی خلیفہ اور لوگوں کے درمیان ایک معاہدہ ہی سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس صورت میں خلیفہ کو معزول کر سکتے تھے کہ وہ قانون شریعت کی برملا خلاف ورزی کرے۔

صرف خاص

خلفائے راشدین نے اپنے مقررہ وظیفے پر قناعت کی اور بیت المال کے سرمائے میں تصرف نہیں کیا۔ غنیمت کا وہ پانچواں حصہ بھی جو ان کے دائرہ اختیار میں تھا عوام کی ضروریات پر خرچ ہوا۔ لیکن امویوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد خلیفہ بیت المال کی رقم اپنی ذاتی ضروریات اور دربار کے رکھ رکھاؤ پر زیادہ خرچ کرنے لگے۔ حضرت عثمان رضؓ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ رضؓ نے شام کے شرفاء کی جائدادیں اپنے نام کرالی تھیں اور ضبط شدہ جائدادیں اپنے اختیار میں لے لی تھیں۔ اس طرح حضرت معاویہ کے تحت تصرف بہت بڑی جائداد تھی جس کا ایک حصہ وہ اپنے استحکام کے لئے اپنے مویدین میں تقسیم کرتے تھے۔ اکثر وہ جائدادیں جو حضرت امیر معاویہ کے قبضے میں تھیں عبد الملک اور بعد کے دوسرے خلفاء کو پہنچیں۔ ہشام بن عبد الملک پوری سلطنت اسلامیہ میں سب سے بڑا زمیندار سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ عمر ابن عبد العزیز کے بیان کے مطابق خلافت کی دولت کا

ایک تہائی حصہ مردان کی اولاد کے پاس تھا۔

سوائے حضرت عمر بن عبد العزیز کے جنہوں نے اپنے لئے صرف ایک درہم روزانہ مقرر کیا تھا اور وہ بھی عوامی باورچی خانے میں چلا جاتا تھا جہاں سے وہ اپنے لئے کھانا منگاتے تھے، دوسرے اموی خلفاء ایسے محتاط نہ تھے کہ محض اپنے وظیفے پر اکتفا کریں۔

دربار

ایسے غیر محدود وسائل کے ساتھ جوان کے ہاتھ میں تھے اموی عہد خلافت میں دربار کا وجود میں آنا ایک فطری بات تھی۔ تین آخری خلفاء کے قتل اور اپنے اوپر قاتلانہ حملے کے بعد امیر معاویہ نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے تدابیر اختیار کیں۔ اس ضرورت کے لئے انہوں نے محافظوں کی ایک جمعیت (بوڈی گارڈ) رکھی اور مسجد میں بھی ایک محفوظ جگہ تعمیر کرائی جسے مقصورہ کہتے تھے۔ مگر ان انتظامات کے بعد بھی یہ نہ تھا کہ امیر معاویہ تک کوئی نہ پہنچ سکے۔

لوگ ان سے ملتے تھے اور مجمع عام میں سخت کلامی تک کی نوبت آتی تھی۔ دولت بے اندازہ چلی آرہی تھی، سلطنت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ایران اور روم کے تمدن سے روابط تھے، لہذا دمشق میں شاہانہ دربار پیدا ہوگیا۔ اپنے لئے ایک تخت بنوا کر اور اس پر بیٹھ کر اس معاملے میں بھی ابتداء امیر معاویہ ہی نے کی۔ ان کے جانشینوں نے ان کا اتباع کیا۔ صرف ایک ولی صفت عمر ثانی تھے جنہوں نے یہ برائیاں رفع کرنے کی سخت کوششیں کیں جو خلافت کے پاک ادارے میں داخل ہوگئی تھیں۔ انہوں نے اپنی تمام دولت اور اپنی بیوی کے زیورات تک بیت المال کو واپس کر دیئے اور ایسی سادگی اور تنگی سے زندگی

بسر کرنے لگے کہ اسی عام سرکاری باورچی خانے کا کھانا کھاتے تھے جو محتاجوں اور مسکینوں کے لئے ہوتا تھا۔ درباری مصاحب، گویے، بھاٹ، شاعر ایسے سب لوگوں کو انہوں نے دربار سے نکال دیا تھا، وہ فرش پر بیٹھتے تھے اور ان کے گرد علماء اور اہل اللہ ہوتے تھے تاکہ انتظام امور خلافت میں ان کو مشورہ دیں۔ مگر عمر ثانی کے بعد امویوں کا شاندار دربار پھر واپس آگیا۔

مجلس شوریٰ

ان بدلے ہوئے حالات میں امویوں کے ماتحت مجلس شوریٰ کی نوعیت بھی بہت متغیر ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لئے بھی یہ ممکن نہ ہوا کہ اسی بنیاد پر مجلس شوریٰ مرتب کریں جو ابتدائی دو خلفاء کے عہد میں تھی۔ ایسے عظیم المرتبہ صحابی جیسے حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مجلس شوریٰ کے رکن ہو سکتے تھے وہ ان کی خلافت ہی کے سخت مخالف تھے۔

ان حالات میں مجلس شوریٰ کے لئے ان کے تقرر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی سرپرستی میں تمام بڑے اموی بھی حضرت علیؓ کی خلافت کے مخالف تھے اس لئے حضرت علیؓ کو اپنی مجلس شوریٰ ہاشمیوں اور ان لوگوں پر مشتمل رکھنی پڑی جن پر ان کو اعتماد تھا اسی وجہ سے حضرت معاویہؓ کو اس کی اجازت بھی نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ شام کے والی رہیں۔

اسی طرح حضرت معاویہ اور ان کے جانشینوں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ہاشمیوں یا ایسے دوسرے لوگوں کو اپنی مجلس شوریٰ میں رکھیں جو ان کے مخالف تھے۔ یہ بالکل اسی معمول کے مطابق تھا جو دور حاضر کی جمہوری پارٹی،

حکومتوں میں برتا جاتا ہے۔
بد نصیبی سے یہ بھی ہوا کہ حادثہ کربلا واقع ہو گیا اس کے بعد علماء کی ہمدردیاں بھی ان کے ساتھ نہ رہیں اور اموی خلفاء امت اسلامیہ کے صاحب علم رہنماؤں کے مشورہ سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ بجائے اس کے خلیفہ کی کونسل میں اب خاندان خلافت کے ارکان اور خلیفہ کے بڑے عہدہ دار اور درباری شریک ہونے لگے۔ اس مجلس میں نہ پوری امت اسلامیہ کی فقہی عقل و دانش منعکس تھی اور نہ یہ پوری امت کی نمائندہ تھی۔

عمر ثانی جس زمانے میں مدینے کے والی تھے انہوں نے علمائے مدینہ کی ایک باضابطہ ایسی مجلس قائم کی۔ پھر جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہ کوشش کی باضابطہ ایسی مجلس شوریٰ قائم ہو جائے جس میں پوری امت اسلامیہ کی فقہی عقل و دانش کی نمائندگی ہو مگر وہ اپنی دو سال چھ ماہ کی مختصر مدت خلافت میں یہ مقصد حاصل نہیں کر سکے کیونکہ نہ ان سے یہ ہو سکا کہ تمام اسلامی مرکزوں سے علماء اور فکر ورائے کے رہنماؤں کو دمشق میں مجتمع کریں اور نہ وہ دارالخلافت مدینے میں منتقل کر سکے۔

عمر ثانی کی وفات کے بعد کسی اموی خلیفہ نے یہ کوشش نہیں کی کہ محض لیاقت اور حسن سیرت کی بنا پر مجلس شوریٰ قائم کرے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، ایک تو یہ حالات تبدیل ہونے کی وجہ سے ممکن نہ تھا اور اموی خلفاء کے زمانے میں مجلس شوریٰ دوبارہ شاہی کونسل بن گئی، جس میں شاہی خاندان کے آدمی اور امویوں کے نہایت طرفدار لوگ شریک رہے۔

انتظامی مقاصد کے لئے مرکز میں نظام حکومت ان تین عنوانات کے تحت منقسم تھا:۔

شعبہ وضع قانون، عدلیہ اور عاملہ۔ یہی عہد حاضر میں ہوتا ہے۔

خلیفہ اور فقہ و اجتہاد

چونکہ حضرت امیر معاویہ بانئے فرمانروائے خاندان بنی امیہ کو کسی ایسی انتخابی مجلس نے خلیفہ منتخب نہیں کیا تھا جس کو مسلمانوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوتا اس لئے وہ اور ان کے جانشین مجموعی طور پر پوری امت اور ان علماء کے اعتماد سے محروم ہو گئے تھے جو ان امور میں عامتہ المسلمین کی رہنمائی کرتے تھے۔ وہ ایسی مجلس شورے بھی نہیں بنا سکے تھے جو ان لوگوں پر مشتمل ہو۔ اس لئے وہ اور ان کے جانشین قوانین وضع کرنے (یا اجتہاد کرنے) کے اس اختیار سے بھی محروم رہے جو خلفائے راشدین اور ان کی مجلس شورے کو حاصل تھے۔ اب قوانین وضع کرنے کا کام علماء نے اپنے ذمے لے لیا اور اس کے لئے انہوں نے اجتہاد اور اجماع کا طریقہ اختیار کیا۔

ان حالات میں یہ بات جو عمومیت کے ساتھ کہی جاتی ہے کلّی طور پر صحیح نہیں ہے کہ امویوں نے حکومت صالحہ کو بادشاہی میں تبدیل کر دیا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ قانون شریعت کی پابندی پر مجبور تھے اس لئے نہ وہ اپنے کو صاحب حاکمیت مطلقہ قرار دے سکتے تھے اور نہ قانون شریعت سے بالا سمجھ سکتے تھے جو ہر ادنیٰ مسلمان کی طرح ان پر بھی عائد تھا۔ چونکہ وہ قانون وضع کرنے (قرآن و حدیث سے مسائل فقہ مستنبط یا اجتہاد کرنے) کے حق سے محروم ہو چکے تھے اس وجہ سے وہ یہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ قانون کا مفہوم بدل کر اپنے لئے کوئی ایسا امتیازی مقام معین کر لیں کہ قانون اور شرعی محصولات کے معاملے میں ان کے ساتھ اصول مساوات نہ برتا جائے۔

خلیفہ اور عدلیہ

تنصیب (انسٹی ٹیوشن) عدلیہ قریب قریب اسی طرح کام کرتی رہی جس طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں۔ بلاشبہ ججوں کا تقرر خلیفہ ہی کرتا تھا۔ لیکن حکومت کے تینوں شعبے بالکل الگ الگ تھے۔ پوری سلطنت میں عدل وانصاف کے لئے قاضی مقرر کئے جاتے تھے جن کو قانون شریعت میں پوری مہارت ہوتی تھی۔ اگرچہ اس دور میں نہ قاضی علمی اعتبار سے اس معیار کے تھے جیسے خلفائے راشدین کے عہد میں اور نہ سیرت کے اعتبار سے، مگر پھر بھی خلیفہ ایسے لوگوں کا تقرر کرتا تھا جو اس وقت سب سے بہتر ہوتے تھے۔ چونکہ قانون شریعت مدون نہیں تھا اس لئے قانون کا منشا، معین کرنے میں قاضیوں کو وسیع اختیارات ہوتے تھے۔ تاہم مشتبہ اور مشکل مسائل میں وہ مفتی سے رجوع کرتے تھے۔ مجموعی طور پر ان تنازعات میں جو معمولی شہریوں کے درمیان ہوتے قاضی انصاف کے ساتھ فیصلے کرتے تھے۔

فرائض، کام اور قاضیوں کی شرائط ملازمت وہی رہیں جو سابقہ حکومت میں تھیں۔ قاضی اسی ضابطہ عمل کی پیروی کرتے رہے جو خلفائے راشدین کے عہد میں تھا۔

خلفاء اپنے کو اس کا ذمہ دار سمجھتے تھے کہ مملکت میں عدل وانصاف کے فرائض انجام پاتے رہیں اور وہ ہفتے میں ایک دن اس کے لئے معین رکھتے تھے کہ مرافعات (اپیلوں) کی سماعت کریں اور طاقتوروں کے خلاف کمزوروں کی شکایات سنیں۔

خلیفہ شعبہ عاملہ کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اور اپنے یہ فرائض انجام دینے اور ملک میں امن و انتظام قائم رکھنے کے لئے وہ صوبوں میں گورنر اور دوسرے بڑے عہدہ دار مقرر کرتا تھا جن میں عدل و انصاف کے لئے قاضی اور جرائم کے انسداد کے لئے پولیس کے عہدے دار ہوتے تھے جن کو صاحب احداث کہتے تھے، خلیفہ کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ جس عہدہ دار کو چاہے برخاست کرے، اس کا تبادلہ کر دے، یا ترقی یا تنزل کر دے۔ انتظام ملکی کے لئے خلفائے بنی امیہ نے مرکز میں مندرجہ ذیل پانچ بورڈ (مجالس) قائم کئے تھے۔

دیوان الجند (ملٹری بورڈ)

یہ وہی عظیم دیوان تھا جو حضرت عمرؓ نے تمام سپاہیوں اور ان کے متوسلین کے وظائف اور دوسرے لوگوں کے گذارے مقرر کرنے کے لئے قائم کیا تھا اموی خلفاء پر یہ الزام ہے کہ انہوں نے وظائف کی اس فہرست میں بعض تبدیلیاں کیں جو حضرت عمرؓ نے اپنے دیوان میں مقرر فرما کے تھے۔ تبدیل شدہ حالات میں یہ بات بالکل طبعی تھی کہ جو صورت حضرت عمرؓ نے چھوڑی تھیں اس میں اموی خلفاء کے ہاتھوں سے تبدیلی ہو۔

جس طریقے پر حضرت امیر معاویہ خلیفہ بنے تھے اس کا مقتضایہ تھا کہ حضرت علیؓ کے موید اور خوارج ان کی مخالفت کریں اور یہ بھی کہ حضرت معاویہ اور ان کے جانشین ان لوگوں کے نام وظائف کی فہرست سے کاٹ دیں جو مسلسل ان کی حکومت کی مخالفت کر رہے تھے۔

اس کا دوسرا اور خاص سبب یہ بھی تھا کہ وظیفہ یاب اس وظیفے کو جو فوجی خدمت کا معاوضہ تھا یہ سمجھنے لگے کہ وہ ان کی گزر بسر کے لئے ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں سب لوگوں کو گزر بسر ہی کے لئے وظیفہ ملتا تھا مگر اس وقت ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو خلافت کی فوجی خدمت انجام دینے سے انکار کرتا۔ لیکن عمر اعظمؓ کے بعد اور پھر امتداد زمانہ کے اثر سے یہ ہو گیا کہ لوگ گزر بسر کے لئے وظائف تو لیتے رہے لیکن فوجی خدمت انجام دینے سے برملا انکار کرنے لگے۔ اس لئے حجاج کو یہ کرنا پڑا کہ فوجی خدمت لازمی قرار دے کر ان لوگوں کو جنگ پر جانے کے لئے مجبور کرے۔

ان حالات میں خلفائے بنو امیہ حق بجانب تھے کہ ایسے لوگوں کے نام وظائف کی فہرست سے کاٹ دیں جن کو فوجی خدمت انجام دینے سے گریز ہو۔ یہ خلیفہ ہشام نے کیا کہ لوگوں کو گذارے کے طور پر وظائف دینے بند کر دئے۔ اس معاملے میں اس نے کوئی استثنےٰ نہیں کیا۔ مگر عراق کے طاقتور گورنر حجاج کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ نو مسلم موالیوں کے نام وظائف کی فہرست میں درج کرنے کی ممانعت کرے۔ حالانکہ موالی فوجی خدمت انجام دینے کے لئے بھی تیار تھے۔

فوجی نظام

خلیفہ کو فوج کے استعمال اور فوجی لوازم اور رسد کی تقسیم پر پورا اختیار تھا۔ وہ ہی ایسے اشخاص کو سپہ سالار منتخب کرتا تھا جسے فن حرب میں کامل مہارت ہو۔ سپہ سالار اعظم کے تحت قبائل کے سردار جنگ میں اپنے آدمیوں کی قیادت کرتے تھے۔ لیکن اگر سرداران قبائل میں موجود نہ ہوتے تو سپہ سالار اعظم اپنے ماتحت

افسروں کو قبائل کی قیادت کے لئے مقرر کر سکتا تھا۔

افواج کی تنظیم ابتداً دس دس کے دستوں میں ہوتی تھی، پھر سو سو کے اور بعد میں ہزار ہزار کے۔ دس آدمیوں پر امیر العشر یا عریف ہوتا تھا، ہر سو پر نائب اور ہر ہزار پر قائد، اور ہر دس قائدین پر ایک امیر۔ سو آدمیوں کی جمعیت کو دستہ کہتے تھے اور دس دستوں کا ایک کردوس ہوتا تھا۔

اس حکومت کی فوجی ترکیب سابقہ حکومت سے مختلف نہیں تھی، جس میں پیدل، سوار، بالائی کام کرنے والوں کی ایک جمعیت اور قلعہ شکنوں کی ایک پارٹی ہوتی تھی جو دبابے کی آڑ لے کر دشمن کے قلعے کی دیواروں میں سوراخ کرتی تھی۔ افواج کے ساتھ افسران انتظام بھی وہی ہوتے تھے جو خلفائے راشدین کے زمانے میں تھے: تنخواہیں تقسیم کرنے والا خزانچی، ترجمان، وقائع نگار، مشیر، قاضی۔

حضرت امیر معاویہ کی حکومت کے آغاز کے ساتھ مسلم فوج کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ جنگ صفین میں دونوں طرف کی فوجیں ایک لاکھ سات ہزار تھیں۔ زید نے سپاہیوں کے جو اعداد و شمار لکھے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں ساٹھ ہزار سپاہی تھے اور بصرہ میں آٹھ لاکھ۔ دوسرے فوجی مرکزوں میں بھی ایسی ہی بڑی بڑی تعداد تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کے عہد میں سپاہی کی سالانہ تنخواہ ایک ہزار درہم تک پہنچ گئی تھی جس میں اس کے بیوی بچوں کا وظیفہ بھی شامل ہوتا تھا۔

مسلمانوں نے سرحدوں پر فوجی مستقر اور استحکامات قائم کئے اور جنگی اہمیت کے مقامات پر قلعے تعمیر کئے۔ وہ سپاہی جو ان فوجی مستقرات پر قیام پذیر

ہو گئے تھے اور بیرونی چوکیوں اور قلعوں کی حفاظت کرتے تھے۔ ان کو باقاعدہ تنخواہیں ملتی تھیں اور کنبے کے وظائف ملتے تھے۔ ہر نئے مفتوحہ ملک میں مسلمان جنگی اہمیت کے اعتبار سے کوئی شہر معین کر لیتے تھے جس میں فوج رہتی تھی۔ یہ پڑاؤ بہت جلد بڑے کاروباری شہر بن گئے۔ کوفہ، بصرہ، فسطاط، قیروان ابتدا میں فوجی پڑاؤ ہی تھے۔ حجاج نے بصرے اور کوفے کے باغی عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے واسط میں جو بصرہ، کوفہ، مدائن اور اہواز کے درمیان واقع تھا ایک نیا فوجی مستقر قائم کیا اور اسکو مستحکم کیا۔

وہ نہایت اہم مقامات جن کی حربی مصلحتوں کو ملحوظ رکھ کر قلعہ بندی کی گئی حسب ذیل تھے:۔ طارسس، عدآنا، مرآش، ملاتیا اور مسیا۔ یہ یا فوجی شاہراؤں کے اتصال پر واقع تھے یا پہاڑی دروں کے دہانوں پر جہاں سے بازنطینی فوجیں برامد ہوسکتی تھیں۔

نقل وحمل کے معاملے میں مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلے میں سہولت تھی۔ بازنطینی اور دوسرے حریف نقل وحمل کے بڑے بھاری بھرکم وسائل استعمال کرتے تھے اور مسلمان سپاہی اور ان کا تمام فوجی سامان اونٹ کی پیٹھ پر چلتا تھا۔

فان کریمر نے مسلمانوں کی فتوحات کے اسباب میں اونٹ کی جو تعریف کی ہے وہ اس قابل ہے نقل کی جائے:۔ "بازنطینی گھوڑوں، گدھوں، خچروں اور بیلوں کے چھکڑوں سے نقل وحمل کا کام لیتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں عرب کہیں زیادہ حفاظت اور تیزی کے ساتھ اپنے آدمی اور سامان خشک ریگستان تک میں، جو یونانی فوج کے لئے بالکل ناموزوں ہوتا تھا، اونٹوں پر لیے جاتے تھے۔ عربوں کے لئے یہ ایسی آسانی تھی جس کے فوائد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

میں یہ رائے قائم کرنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ عربوں نے بہت سی فتوحات اپنے اونٹ کی مدد سے حاصل کیں۔ اس صابر چوپائے نے ان کے لئے شام اور مصر فتح کیا۔ دافعی اسلام کی فتوحات اسی نے حاصل کیں۔"

جب ضرورت ہوتی تو مسلمانوں نے دوسرے وسائل نقل وحمل سے بھی کام لیا۔ جیسے لدو گھوڑے، خچر اور گدھے ۔ وہ عظیم منجنیق جس کا نام عروس تھا جہاز پر سندھ بھیجا گیا۔ اسی کے ساتھ دوسری منجنیق، سامان رسد اور ضرورت کی چیزیں تھیں۔

مسلمانوں کی ہمت اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ہمیشہ بلند رہی۔ وہ اب بھی اپنے کو اللہ کے پاس مجاہد سمجھتے تھے اور اپنے مثالی طرز عمل اور شجاعانہ کارناموں سے اسلام کی روشنی پھیلانے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ اس عہد میں جو وسیع پیمانے پر فتوحات ہوئیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے برتر تھے۔

ان کا مرکز مہمات دمشق تھا اور وہ بیک وقت چار محاذوں پر فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ یعنی سندھ میں، شمالی افریقہ میں، اسپین میں اور وسطی ایشیا میں۔ انہوں نے قسطنطنیہ کے دروازے تک پر دستک دی۔ مختصر یہ ہے کہ ان کی حکومت چین سے ناربون تک پھیلی جو فرانس میں تھا۔ اتنی مختصر مدت میں ایسی عظیم سلطنت اموی صرف اس وجہ سے قائم کر سکے کہ ان کے معتقدات دوسروں سے افضل تھے ورنہ یہ نہ ہو سکتا۔

دیوان الخراج

یہ مجلس (بورڈ) ریاست کے پورے مالیے کا انتظام کرتی تھی۔ وصول

اور ادائیگیوں کا تمام کام مرکز کی مالی مجلس میں ہوتا تھا اور اس کے تمام حسابات بھی وہیں رکھے جاتے تھے۔ صوبوں کی مالگزاری کی فاضل رقوم مرکزی مالی مجلس میں جمع ہوتی تھی اور جن میں خسارہ ہوتا تھا وہ بھی یہیں سے پورا کیا جاتا تھا۔

امویوں کے عہد میں آمدنی کے وسائل اکثر وہی تھے جو خلفائے راشدین کے عہد میں مگر بعض ایسے وسائل بھی نکالے گئے جو ناگوار تھے۔

(۱) خمس۔ غنیمت، معدنیات کی پیداوار، اور دفینوں کا پانچواں حصہ تھا۔

ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم خمس کو ان مدات میں تقسیم کرتے تھے جن کا قرآن میں ذکر ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشینوں نے آپ کے رشتہ داروں کو ان کا حصہ دینا بند کر دیا؛ اور یہ فوج کے سامان پر خرچ ہونے لگا۔ یہی طریقہ امویوں نے اختیار کیا۔

(۲) زکواۃ۔ زکواہ کے قواعد میں کوئی مداخلت اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ نص قرآنی میں معین کر دی گئی ہے اور اجتہاد سے بھی اسمیں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی

زکواۃ کے وسائل وہی رہے اور وہ واقعی انہی آٹھ مدات پر صرف ہوئی جو تعین کے ساتھ قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں۔ مگر حضرت امیر معاویؓ نے سرکاری ملازمین سے زکواۃ وصول کرنے کے معاملے میں ایک اچھی اصلاح کی۔ جب وہ ان کے سالانہ وظائف تقسیم کرتے تھے تو اس میں سے زکواۃ کی رقم وضع کر لیتے تھے۔

یہ اسی قسم کا طریقہ تھا جو اس زمانے میں برتا جاتا ہے کہ سرکاری ملازمین

کی تنخواہوں میں سے انکم ٹیکس وضع کر لیتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے وظیفے کی رقم سے اس کے سال گذشتہ کے سرمائے کا اندازہ کر کے یہ حساب لگا لیا جاتا تھا کہ اس پر کتنی زکواۃ واجب ہو گی اور وہ وصول کر لی جاتی تھی۔ اس طرح حکومت اس دُہری زحمت سے بچ جاتی تھی کہ ایک مرتبہ وظائف تقسیم کرے اور پھر زکواۃ وصول کرے۔

(۳) عشر:۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ عشر پیداوار کا وہ دسواں حصہ تھا جو مسلمان زمینداروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشر ان زمینوں پر عائد کیا تھا جو پہلے سے مسلمانوں کی ملکیت میں تھیں اور نیز ان زمینوں پر جو خود آپ نے ان میں تقسیم فرمائی تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کیا تو خیبر کے یہودیوں نے یہ درخواست کی کہ اراضیات کا زیادہ حصہ انہی کے پاس رہنے دیا جائے اور خراج کے طور پر ان سے پیداوار کا نصف حصہ لے لیا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ اس طرح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہد میں زمین کی دو قسمیں ہو گئیں: ایک عشری زمین اور دوسری خراجی زمین۔ اگر آبپاشی کی قدرتی سہولتیں مہیا ہوتی تھیں تو عشری زمین سے حکومت کو پیداوار کا دسواں حصہ وصول ہوتا تھا اور اگر خود مسلمان زمیندار کو آبپاشی کا انتظام کرنا پڑتا تھا تو صرف بارہواں حصہ۔ لیکن خراجی زمین کی پیداوار کا نصف حصہ کاشتکار سے بہر حال لیا جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں یہ طے ہوا کہ مسلم سپاہیوں کے درمیان زمینیں تقسیم نہیں ہوں گی بلکہ ان کے سابق مالکوں ہی کے قبضے رہیں گی حکومت کو ان کا خراج ادا کریں گے۔ اور چونکہ مسلمانوں کو اسی خیا

بلنے مسلمان عرب یا غیر عرب۔ تاہم امویوں کو اپنی اس حماقت کی سخت سزا بھگتنی پڑی۔ انہی موالیوں کی شکایت اور بے اطمینانی اس کا باعث ہوئی کہ امویوں کی وہ طاقتور حکومت جو مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں نارکیوں تک پھیلی ہوئی تھی یکایک ان سے چھین گئی۔

خراج

امویوں کے زمانے میں خراج کی وجہ سے بڑی سخت پیچیدگی پیدا ہوئی۔ بیان کیا جاچکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ قاعدہ معین کر دیا تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی زرعی اراضیات مسلمان سپاہیوں (مجاہدوں) کے درمیان نہ تقسیم کی جائیں بلکہ سابق زمینداروں کے حوالے رہیں جن پر وہ خلافت کو خراج ادا کریں، اور اس خراج سے مسلمانوں کو وظائف دیئے جائیں۔ مسلمانوں کے لئے اس کی بھی ممانعت تھی کہ وہ غیر مسلموں کی زمینیں خریدیں۔ خوف یہ تھا کہ اگر وہ زمینیں خریدیں گے تو یہ دعوے بھی کریں گے کہ ان سے بجائے خراج کے عشر لیا جائے اور اس طرح خراجی زمینیں عشری زمینیں ہو جائیں گی۔ خلافت راشدہ کے عہد میں اس طریقے پر خوبی سے عمل درامد ہوا۔ اگر خراجی زمین کا کوئی مالک مسلمان ہو جاتا تو اس کو اپنی زمین چھوڑنی پڑتی تھی اور خلافت کا وظیفہ دار ہو جاتا تھا۔ اور اگر وہ یہ چاہتا تھا کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی زمین اسی کے پاس رہے تو وہ اتنی ہی رقم حکومت کو زمین کے لگان میں ادا کرتا تھا جتنا اسکا خراج ہوتا۔ لیکن امویوں کے عہد حکومت میں بعض با اثر قریش نے بخلاف فرمان حضرت عمرؓ غیر مسلموں کی زمینیں خریدیں اور مزید براں یہ بھی کیا کہ خراج سے استثنیٰ حاصل کر کے عشر ادا کرنے لگے۔ اس طرح وہ یہ دہرا نفع اٹھانے

تھے کہ حکومت سے ان کو وظائف بھی ملتے تھے اور زمینداریوں کے مالک بن کر بجائے خراج کے عشر ادا کرتے تھے۔

عراق کا طاقتور گورنر حجاج طاقتور قرابش کی یہ چیرہ دستی برداشت نہیں سکا اور حکومت کا مالی استحکام بحال رکھنے کے لیے اس نے ایسے لوگوں سے خراج وصول کیا اور ان غیر مسلموں سے بھی خراج ہی جو مسلمان ہو گئے تھے۔ چونکہ اس مسئلے کا کوئی قابل اطمینان حل نہیں نکالا گیا اس لئے مالی نظام میں بڑی ابتری پھیلی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے حضرت عمر بن عبد العزیز رضؓ نے بالآخر یہ مسئلہ طے کیا، جس سے سب کو اطمینان ہو گیا۔ یہ قاعدہ بنا دیا گیا کہ، جیسا خلفائے راشدین کے عہد میں تھا، آئندہ خراجی زمینیں عشری نہیں بنائی جائیں گی۔ لیکن اگر سابق مسلمان یا نو مسلم زراعت کرنا چاہیں، تو وہ مرکزی حکومت سے زمینیں پٹے پر لیں اور فریقین کے درمیان جو لگان طے ہو جائے ادا کرے۔

فئے

فئے میں وہ نجی ریاستیں شامل تھیں جو ان سابق غیر مسلم امرائے چھوڑی تھیں جو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور وہ نجی ریاستیں تھیں جو حکومت کی عملاً مخالفت یا مسلمانوں کے خلاف بغاوت کے جرم میں ضبط کی گئی تھیں، یا وہ زمین اور جنگل تھے جن کی ملکیت کا کوئی دعویدار نہیں تھا۔ فارس میں وہ زمینیں بھی اسی مد کے تحت داخل ہوئیں جو آتش خانوں کے لئے وقف یا محکمہ ڈاک کے مصارف کے لئے مخصوص تھیں۔ یہ وہ زمینیں تھیں جن سے خلیفہ نے اپنے موبدوں یا ان سپاہیوں کو جنہوں نے میدان جنگ میں کارہائے نمایاں کئے

تھے وظائف دیئے ۔ امویوں کے عہد میں بیت المال کی مد جس پر خلیفہ کو کلی اختیار حاصل تھا خلیفہ اور اس کے خاندان کے لئے حامی اور مددگار مہیا کرنے کا بڑا طاقتور ذریعہ ہو گئی ۔ فئے کی مد سے بے احتیاطی کے ساتھ عطیات اور انعامات دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں ایک بڑا طاقتور زمیندار طبقہ پیدا ہو گیا۔ اس مد سے جتنی آمدنی (بصورت مالگزاری) حکومت کو وصول ہوتی تھی، وہ رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ ہوتی تھی ۔ نہریں کھدوائی گئیں، بند باندھے گئے تالاب بنائے گئے اور ان کے ذریعے سے کھیتوں تک پانی پہنچانے کے لئے نالیاں بنائی گئیں ۔

اس عہد میں لوگوں پر بعض ایسے محصولات لگائے گئے جو خلاف شریعت تھے ۔ مصر کے ہر ضلع میں یہ محصولات لگے اور ضلع کا افسر اعلیٰ ان کی ادائیگی کا ذمہ دار بنایا گیا۔ یہ محصولات جنس میں وصول کئے جاتے تھے ۔ مثلاً جہاز بنانے کا سامان یا اس کام کے آلات ۔ اس جنس کے بدلے میں کوئی نقد رقم قبول نہیں کی جاتی تھی اور پوری جماعت پر اس کی ادائیگی واجب ہوتی تھی جب کسی کاشتکار کی زمین کو پانی دیا جاتا تھا تو اس سے کچھ فیس وصول کی جاتی تھی جسے معمول کہتے تھے ۔ دستاویزات لکھنے کے لئے جو کاغذ استعمال ہوتا تھا اس پر فیس وصول کی جاتی جو اسٹامپ کی فیس کے مشابہ ہوتی ۔ اموی عہد کے دار نوروز اور مہرگان کے تہواروں پر اور شادیوں پر حکومت کی طرف سے تحائف قبول کرنے لگے تھے ۔

یہ غیر شرعی وصولیاں ان ملکوں کے لئے نئی نہیں تھیں جن پر یہ عائد کی گئیں ۔ حضرت عمرؓ نے یہ بند کر دی تھیں ۔ امویوں نے انہیں دوبارہ جاری کر دیا۔ لیکن چونکہ شرعاً ان کی وصول تحصیل جائز نہیں تھی اس لئے

عمر ثانیؒ نے انہیں ممنوع قرار دیا۔ ان کے بعد اموی خلفاء نے یہ پھر دوبارہ عاید کردیں۔

بچے کا ٹیکس: اگر کوئی ٹیکس ازروئے شریعت سب سے زیادہ قابل اعتراض تھا تو وہ بچے کی پیدائش پر تھا جو پر بدق پر عائد کیا گیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات اور ان کی حقیقت کے خلاف تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے یہ خلاف اخلاق ٹیکس منسوخ کیا۔

۳۔ دیوان رسائل۔ لفظی معنی کے اعتبار سے یہ دیوان خط و کتابت ہوا جو اموی خلفاء کے عہد میں باضابطہ قائم کیا گیا۔ صوبوں کے گورنروں (والیوں) دوسرے عمال اور رعایا کے نام جو مراسلے اور احکام جاتے تھے وہ اسی دیوان سے صادر ہوتے تھے۔ اور دیوان رسائل کی وساطت سے دوسرے دیوانوں کے ساتھ روابط قائم رہتے تھے۔

۴۔ دیوان خاتم۔ حضرت امیر معاویہؓ نے یہ دیوان اس مقصد سے قائم کیا تھا کہ خلیفہ کی طرف سے جو احکام صادر ہوں ان کا یہاں اندراج ہو اور اصل حکم پر مہر لگا کر وہ بھیجا جائے۔ دفتر کے لئے نقل رکھنے اور احکام پر مہر لگا کر روانہ کرنے کا طریقہ صرف مرکزی حکومت ہی کے لئے مخصوص نہیں تھا بلکہ والیوں نے بھی اس کی پیروی کی۔

۵۔ دیوان برید: یہ فارسی کے لفظ بریداں سے وضع کیا گیا ہے۔ فارس میں یہ دستور تھا کہ ڈاک کے گھوڑوں کی دمیں کاٹی جاتی تھیں تاکہ دوسرے گھوڑوں میں اور انہیں امتیاز رہے اور نیز دم بریدہ گھوڑے کو دیکھ کر اس کے سوار کو پہچانا جاسکے کہ وہ حکومت کا پیغام رساں ہے۔ یہ دیوان بھی حضرت معاویہؓ ہی نے قائم کیا تھا ابتدا میں صرف حکومت کے کام کے لئے

قائم ہوا تھا۔ بعد کو رعایا کی خدمت بھی اس کے ذمے ہو گئی۔ بڑی بڑی شاہراہیں منازل میں تقسیم تھیں۔ ایک منزل سے دوسری منزل کا فاصلہ بارہ میل ہوتا تھا اور ہر منزل پر ڈاک لے جانے کے لئے گھوڑے تیار رہتے تھے۔ عرب اور شام میں اونٹوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اس طرح منزل بہ منزل نئے گھوڑوں یا اونٹوں اور ان کے تازہ دم سواروں کے ذریعے سے سلطنت کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ڈاک کا انتظام تھا۔

عبدالملک کے عہد میں ڈاک کا انتظام پہلے سے بہت بہتر ہو گیا۔ اب ہر منزل پر گھوڑوں کی تبدیلی کے ذریعے صرف ڈاک ہی نہیں جاتی تھی، بلکہ تعجیل کے ساتھ سفر طے کرنے کے لئے عمال حکومت بھی یہی ذریعہ اختیار کرتے تھے۔ اشد ضرورت کے وقت ڈاک کی گاڑیاں فوج کے تعجیل حمل و نقل کے لئے بھی استعمال ہونے لگیں۔ وہ ایسی تھیں جن میں بیک وقت پچاس سے سو آدمی تک سوار ہو سکتے تھے۔

افسر برید (پوسٹ ماسٹر) اپنے ڈاک کے فرائض کے علاوہ خلیفہ کو اپنے علاقے کے واقعات سے بھی مطلع رکھتا تھا۔

اصلاحات

سکے، ناپ، تول اور انتظام حکومت میں عربی زبان کی ترویج کے لئے اموی عہد میں بعض اصلاحات کی گئیں

سکہ

ظہور اسلام سے قبل عرب فارس اور رومی سکے استعمال کرتے تھے

بلاذری کا بیان ہے کہ رومی مصر سے کاغذ لیتے تھے۔ عبدالملک کے زمانے میں مصری کاغذ پر بطور واٹر مارک مسیحی کلمات لکھے رہتے تھے اور صلیب کا نشان ہوتا تھا۔ عبدالملک نے بجائے ان کے یہ آیت لکھا دی قل ھو اللہ احد اس پر رومیوں نے یہ دھمکی دی کہ ہم دیناروں پر تمہارے پیغمبر کے خلاف توہین آمیز کلمات لکھا دیں گے۔ اس جھگڑے کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ عبدالملک نے ۷۴ھ میں دینار اور درہم خود اپنی حکومت کے انتظام میں ڈھلوائے اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔

یہ سکے وزن میں برابر اور کاریگری کے اعتبار سے بڑے خوب صورت تھے دینار اور درہم کی قیمت کا تناسب یہ رکھا گیا۔ ۱ : ۲۰، اور وزن میں ۱۰: مسلمانوں کے دینار کو زیادہ مقبول بنانے کیلئے عبدالملک نے اپنے دینار میں رومی سکے سے زیادہ سونے کی مقدار بڑھا دی۔ سکے پر کندہ تھا۔ قل ھو اللہ احد دوسری طرف یہ کندہ تھا۔ لا الٰہ الا اللہ

اوزان اور پیمان

دولت اسلامیہ کے آغاز کے ساتھ ہی اہل اختیار نے اس پر زور دیا کہ ناپ اور تول میں صحیح پیمانے اور باٹ استعمال کئے جائیں۔ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کو اس کا بڑا خیال تھا وہ خود کوفے کے بازار میں اس طرح گشت کرتے تھے کہ ہاتھ میں دُرّہ ہوتا تھا اور دیکھتے تھے کہ کوئی غلط باٹ اور غلط پیمانہ استعمال کر کے لوگوں کو دھوکہ تو نہیں دیتا۔

امویوں کے عہد میں پولیس کے افسر اس پر مامور کئے گئے کہ باٹوں اور پیمانوں کی نگرانی کریں۔ ولید اول کبھی بازاروں میں گشت کرنے کا عادی تھا

بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ اس نے اشیاء کی قیمتوں میں کمی کر دی۔ امویوں کے عہد میں باٹوں اور پیمانوں کا معیار معین کیا گیا اور ان پر گورنمنٹ کی مہر لگائی جاتی تھی۔

زبان کی تبدیلی

یہ امتیاز عبدالملک ہی کو حاصل ہوا کہ اس نے انتظام حکومت میں بجائے رومی اور فارسی زبانوں کے عربی اختیار کی۔ یہ اصلاح حجاج کی تجویز پر عمل میں آئی۔ شامی، مصری اور فارسی دفاتر کے کاغذات کار دائی عربی میں ترجمے کیے گئے اس طرح عربی پوری اسلامی قلمرو میں دفتری زبان ہو گئی۔ اس کے باوجود مختلف مذاہب کے وہ لوگ جو انتظام حکومت میں پہلے سے تھے قائم رکھے گئے اور رفتہ رفتہ انتظامی امور میں مسلمانوں کی تربیت ہو گئی۔

مذہبی اور معاشرتی تنظیم

اس عہد حکومت میں مذہبی تنظیم وہی رہی جو پہلے سے تھی۔ مذہبی عقائد میں ابھی لچک تھی۔ اور جو چند لوگ اپنے خیالات کی وجہ سے قتل ہوئے اس کا سبب یہ تھا کہ ان کو اموی خاندان کی حکمرانی کے لیے خطرناک سمجھا گیا۔ اس لئے نہیں کہ ان کے مذہبی خیالات عام مشترکہ خیالات سے مختلف تھے۔ اگر کچھ دار و گیر تھی تو وہ مذہبی نہیں سیاسی تھی۔

مسجد اب بھی وہی اہم کام کر رہی تھی جو اس نے ابتدار سے اسلامی دولت کے مقاصد کی ترقی میں کیا تھا یعنی اس کے ذریعے مسلمانوں میں مساوات آزادی، اخوت، اجتماعی انصاف، تنظیم و تربیت اور اللہ کی اطاعت کا شوق

پیدا ہو رہا تھا۔ خلیفہ اب بھی مسلم جماعت کا مقرر کیا ہوا بیش امام اور خلیفہ سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ کا تقرر اور تنزل مسجد ہی میں ہوتا تھا اور اپنے تقرر کے وقت خلیفہ اب بھی مسجد میں خطبہ دیتا تھا۔ مسلمان بھی راست خلیفہ یا اس کے نمائندے کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ صوبوں میں والی کے لئے مسجد ویسی ہی تھی جیسی خلیفہ کے لئے دار الخلافت میں۔ اس کا تقرر اس شرط پر ہوتا تھا کہ نماز قائم کرے گا اور جہاد کرے گا۔ پوری ولایت کے ممبر خطاب اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ ممبر پر تقرر کرنا والی کا وہ حق تھا جو اس کو خلیفہ کی طرف سے عطا ہوتا تھا۔

اموی خلفا کی طرح والئ صوبہ بھی اپنا کام اسی طرح شروع کرتا تھا کہ ممبر پر آئے اور خطبہ دے۔ اللہ کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلواۃ وسلام کے بعد وہ اپنے تقرر کا اعلان کرتا اور وہ نامہ تقرر پڑھ کر سناتا جس میں اسکی ملازمت کی شرائط درج ہوتی تھیں۔ مسجد کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی والی خطبے کے معاملے میں اپنا اختیار برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہوتا تھا تو وہ اس عہدے سے معزول کر دیا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ عہد بنو امیہ میں مسجد وہی سب کام کرتی رہی جو خلفائے راشدین کے عہد میں اس سے انجام پاتے تھے۔ امویوں کی وسیع سلطنت میں جتنا اضافہ ہوتا گیا۔ جگہ جگہ نئی مسجدیں تعمیر ہوتی گئیں اور پرانی مسجدیں بڑھائی گئیں اور ان کو زینت دی گئی۔

مسلمانوں کی دوسری اہم تنصیب (انسٹی ٹیوشن) زکواۃ اسی طرح جاری رہی جس طرح خلفائے راشدین کے عہد میں تھی۔ حکومت کے ایک ٹیکس ہی کی طرح زکواۃ وصول کی جاتی تھی۔ بیت المال میں ایک جداگانہ مد کے تحت جمع ہوتی تھی، اور انھی مدات پر خرچ ہوتی تھی جو قرآن نے معین کر دیئے ہیں۔

دوسرے مذہبی فرائض کے متعلق یہ ہے کہ وہ اموی فرمانرواؤں نے کم وبیش قابل اطمینان طریقے پر انجام دیئے۔ خلیفہ مناسک حج ادا کرانے کیلئے اسی طرح کسی شخص کو سربراہ مقرر کرتا تھا جس طرح سابق خلفاء کا طریقہ تھا۔ اموی خلفاء نے جہاد کا اہم فریضہ بھی حسب سابق انجام دیا۔ ان کے غیر محدود وسائل کی مدد سے اسلام کی روشنی تمام دنیا میں پھیلی اور اسلام کے مقصد میں ترقی ہوئی۔

غیر مذہب کے لوگوں کے ساتھ قرآن کی اس آیتہ کے مطابق لا اکراہ فی الدین رواداری برتی گئی۔ اموی خلفاء نے ذمیوں کو اپنی ذمہ داری سمجھا ان کو ضمیر اور مذہبی عقائد کی پوری آزادی دی اور جان، مال، آبرو کے تحفظ کی پوری ضمانت۔ علاوہ ازیں انہوں نے ان کو اس کا پورا موقع دیا کہ اپنی ثقافت اور روایات کو ترقی دیں اور اپنے مذہبی قوانین کے مطابق اپنے ذاتی امور کا انصرام کریں۔

جزئیے کے عوض فوجی خدمت سے ان کو استثنا حاصل رہا۔ مفتوحہ زمینیں اسی طرح ان کے قبضے میں رہیں جس طرح سابق خلفاء کے زمانے میں نہ ان کو کوئی مسلمان خرید سکتا تھا اور نہ یہ کسی اور طرح ان کے حق میں منتقل ہو سکتی تھیں۔ غیر مسلموں کے لئے حکومت کی ملازمت کے دروازے اموی عہد میں کھلے رہے، ان کو صرف وہ ملازمتیں نہیں ملتی تھیں جو مذہبی امور کی انجام دہی سے متعلق تھیں۔

البتہ اموی عہد میں نومسلموں کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات خراب رہے۔ ان کی وسیع فتوحات کے دوران میں کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے اور یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ ان کے موالی بنکر عرب خاندانوں کے ساتھ وابستگی

حاصل نہ کر سکی ۔ وہ نومسلم جو بحیثیت موالی کسی عرب خاندان سے وابستہ تھے۔ اس خاندان کی وساطت سے اپنے دعوے پیش کر سکتے تھے۔ لیکن وہ جن کا کسی عرب خاندان سے تعلق نہیں ہوتا تھا ان کے لئے اپنے حقوق حاصل کرنا اس وجہ سے دشوار تھا کہ اس کے لئے کوئی آئینی نظام موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ مسلمان تھے ان سے جزیہ اور خراج لیا جا رہا تھا۔ جو مسلمان حضرت عمرؓ کے فرمان کے خلاف خراجی زمینوں کو عشری بنا رہے تھے اگر ان سے خراج وصول کیا جاتا تو یہ حق بجانب ہوتا لیکن مسلمانوں سے جزیہ وصول کرنا وہ نئے مسلمان ہی سہی ہرگز جائز نہیں تھا۔ وہ جہاد کرتے تھے مگر ان کو وظائف نہیں دئیے جاتے تھے حجاج نے مزید ستم یہ کیا کہ موالیوں کو ان شہروں میں جا کر آباد ہونے کی ممانعت کر دی جہاں وہ سرکاری فہرست وظائف میں اپنا نام درج کرا سکتے۔ حجاج کے عہد انتظام عراق میں موالیوں کے ساتھ برابر یہ زیادتیاں اور ناانصافیاں جاری رہیں مگر جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو کچھ عرصے کے لئے خلفائے راشدین کی روایات تازہ ہو گئیں۔

انہوں نے موالیوں کو وہ تمام حقوق دئیے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل تھے۔ انہوں نے موالیوں سے جزیہ لینا بند کر دیا، ان کے وظائف مقرر کئے گئے خراج کے لئے جو قواعد سب کے لئے تھے وہی موالیوں پر عائد ہوئے۔ عمر ثانی کی وفات کے بعد ان کے جانشین نے ان کی اصلاحات منسوخ کر دیں اور ان معاملات میں کوئی معین پالیسی اختیار نہ کی، لہذا نومسلم پھر دشواریوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوئے ۔ ایک طرف نومسلموں کی شکایات بڑھیں اور اس وجہ سے ان میں بے چینی اور بے قراری پیدا ہوئی دوسری طرف سلطنت امویہ میں اختلال واقع ہوا اور نومسلم پوری قوت سے عباسیوں کی بغاوت میں شریک ہو گئے۔ اس

بغاوت کا نتیجہ اموی اقتدار کا خاتمہ تھا۔

تنظیم بحریہ

یہ امتیاز حضرت معاویہؓ کو حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اسلام میں بحری بیڑہ تعمیر کیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب حضرت معاویہؓ شام کے والی تھے انہوں نے براہ سمندر بازنطینی سلطنت پر حملہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس اجازت میں یہ شرط عائد کی کہ بحریے میں خدمت لازمی نہیں بلکہ قطعی اختیاری اور رضاکارانہ ہو۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے گرمی اور جاڑے کے موسم میں شام اور مصر کے ساحلوں سے یونانی علاقوں پر پچاس تاختیں کیں اور ۲۸ھ میں قبرص فتح کیا ۳۴ھ میں انہوں نے یونانیوں کے خلاف ایک اور مہم بھیجی جس میں دو سو جہاز تھے۔ بازنطینی اس کے مقابلے میں چھ سو جہاز لائے۔ جنید بن ابی امیہ الازدی نے ۵۳ھ میں روڈز فتح کیا اور یونانیوں کے دلوں میں مسلم بیڑے کی ہیبت بیٹھ گئی۔

۵۴ھ میں امیر معاویہ نے قسطنطنیہ پر خشکی اور سمندر سے بیک وقت حملہ کیا۔ یونانی تحریرات سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے بیڑے میں ایک ہزار آٹھ سو جہاز تھے۔ ۵۴ھ میں کریٹ پر طاقت کی گئی۔ ۴۸ھ اور ۶۹ھ میں دو سو جہازوں کا ایک بیڑا اسکندریہ سے چلا اور سسلی (سقلیہ) پر حملہ آور ہوا۔

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے وقت مسلمانوں کا بیڑا اتنا عظیم تھا کہ اس میں ایک ہزار سات سو جہاز تھے۔ اتنے وسیع پیمانے پر جہازوں کی تعمیر میں

اس وجہ سے سہولت ہوئی کہ لبنان کے پہاڑوں میں بہت سے جنگل تھے۔ شام
کے ساحل پر جہاز سازی کے کارخانے تھے اور ان کے علاوہ کئی مصر کے ساحل
پر تھے۔ ولید اوّل کے عہد میں صنعت جہاز سازی کو بڑی ترقی ہوئی۔ مغربی
بحرہ روم کے اکثر جزائر اور سب سے بڑھ کر اسپین، پرتگال اور سندھ مسلمانوں
کے طاقتور بیڑے ہی کی مدد سے فتح ہوئے۔

بیڑہ پانچ دستوں میں تقسیم تھا۔ شام کے دستے کا مستقر لوڈیسیہ تھا
افریقہ کا ٹیونس، مصر کے دستے کا دائرہ عمل اسکندریہ سے شروع ہوتا تھا،
نیل کے دستے کا مستقر بابل تھا اور ایک خاص دستہ نیل کے دہانے کی حفاظت
کے لئے ساحل کے اس علاقے پر رہتا تھا جو بازنطینیوں کے حملے کی زد میں تھا
مصر کے لئے خاص اسلحہ خانے اور جہاز سازی کے کارخانے بابل اور روضہ
(کلا یسما) میں تھے ۲۶۲۔

صرف ٹیونس کے کارخانہ جہاز سازی نے موسیٰ ابن نصیر کے زمانۂ ولایت
میں سو جہاز تعمیر کئے۔ مسلمانوں کی جہاز رانی دو جداگانہ علاقوں میں تقسیم
تھی، ایک بحرہ روم میں اور دوسری بحرہ ہند میں۔ ان دونوں علاقوں میں
جو جہاز استعمال ہوتے تھے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف تھے۔
بحرہ روم کے جہاز بحر احمر اور بحر ہند کے جہازوں سے بڑے ہوتے تھے۔

اس عہد میں تجارتی بیڑے کو بھی خاصی ترقی ہوئی۔ بحر ہند کے نہایت
اہم بندرگاہ عدن اور سیراف تھے اس کے بعد بصرہ، دیبل اور ہرمز، عدن
افریقہ اور عرب کے درمیان تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا اور اسی جگہ
ہندوستان، چین اور مصر کی تجارت ایک نقطے پر مجتمع ہوتی تھی۔ سیراف خلیج فارس میں
وہ عالمگیر بندرگاہ تھی جہاں سے پورے فارس کی درآمد اور برآمد ہوتی تھی

مشرق بعید کے تمام بڑے شہروں میں مسلمانوں کے کارخانے یا تجارتی مرکز تھے۔

عہد اموریہ میں صوبائی تنظیم

عہد امویہ میں صوبائی انتظام وہی رہا جو خلفائے راشدین کے زمانے میں تھا۔ انتظامی امور میں صوبے بڑی حد تک خود اختیار تھے۔ ہر صوبے کے تمام اخراجات اسی صوبے کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ رفاہ عامہ کے ایسے تمام کام، جیسے سڑکیں، نہریں، سرکاری عمارتیں، مسجدیں، مدرسے وغیرہ صوبائی خزانے سے انجام پاتے تھے۔ صوبے کے خرچ سے جو کچھ بچتا تھا وہ مرکزی بیت المال میں جمع ہوتا تھا اور اگر خسارہ رہتا تھا تو مرکزی بیت المال سے وہ پورا کیا جاتا تھا۔

اموی انتظام کا ایک پہلو بڑا اہم ہے اور سابق کے مقابلے میں ایک ترقی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے مالی انتظام کو سیاسی انتظام سے الگ کر دیا پہلے امیر یا والی پورے انتظام کا افسر اعلےٰ ہوتا تھا اور سیاست و مال کے دونوں شعبے اسی کے تحت ہوتے تھے۔ یہ اصلاح امیر معاویہ نے کی اور اپنے سامنے ہی انہوں نے تمام صوبوں میں ان دونوں شعبوں کو الگ الگ کر دیا۔ حاکم امور مال اور خصوصاً منتظم مال گزاری کو صاحب الخراج کہتے تھے۔

خلیفہ صوبوں کے والی اپنے آپ مقرر کرتا تھا اور ان کو یہ اختیار دیتا تھا کہ اپنے ماتحت والی یا منتظم وہ خود مقرر کریں۔ مگر یہ تقررات بھی خلیفہ کے سامنے منظوری یا توثیق کے لئے پیش ہوتے تھے جس سے اس کو ان کا

علم رہتا تھا۔

اموی عہد کے اختتام تک سلطنت اسلامیہ چار بڑے بڑے صوبوں میں منقسم تھی جن میں سے ہر صوبہ کئی کئی بڑے اضلاع میں تقسیم تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت صوبوں میں صرف تین دیوان ہوتے تھے:

۱- دیوان الجند

۲- دیوان الرسائل

۳- دیوان المستغلات

دیوان الجند وظائف کی فہرستوں یا رجسٹروں سے متعلق جتنی کاروائی ہوتی تھی وہ انجام دیتا تھا۔

دیوان الرسائل وہ خاص منشی خانہ یا سیکریٹریٹ تھا جو ہر قسم کی رسل و رسائل کرتا تھا اور حکومت کے تمام محکموں کے درمیان ربط قائم رکھتا تھا۔

دیوان المستغلات صوبے کا محکمہ مال ہوتا تھا جہاں وصول اور ادائیگیوں کے تمام حسابات رکھے جاتے تھے۔

دیوان البرید مرکز میں تھا جسکی نیابت صوبوں میں صاحب البرید (پوسٹ ماسٹر) کرتا تھا۔

عہد امویہ میں صوبوں کے عامل وہی ہوتے جو عہد خلافت راشدہ میں تھے۔

مختلف عہدہ داروں کے فرائض و اعمال

والی صوبے میں خلیفہ کا نائب ہوتا تھا اور وہی تمام فرائض انجام

دیتا تھا جو مرکز میں خلیفہ۔ یہ بھی صوبے کی مرکزی مسجد میں امامت کرتا تھا۔ جمعے اور عیدین کی نمازیں پڑھاتا تھا اور اس موقع پر خطبہ دیتا تھا۔ نیز تمام صوبے کی مسجدوں میں نماز باجماعت اور ان میں امامت کا انتظام کرتا تھا۔ وہ صوبے کی تمام افواج کی خود قیادت کرتا یا کسی موزوں آدمی کو ان کا سپہ سالار مقرر کرتا تھا۔ وہ صوبے کے تمام عہدہ داروں کا تقرر کرتا تھا جیسے صاحب الخراج، عامل صدقات، دیوانوں کے کاتب اور دوسرے لوگ۔ بعض اوقات اہم آسامیوں کے لیے خود خلیفہ بھی عہدہ دار مقرر کرتا تھا ان سب عہدوں کے کام وہی تھے جو ایسے ہی عہدہ دار مرکز میں انجام دیتے تھے۔

باب ۵

تعصبات اسلامی تحت خلافت عباسیہ

خلافت عباسیہ قائم ہونے کے بعد دنیائے اسلام کی وحدت باقی نہیں رہی - عبدالرحمٰن اوّل نے، جو ایک اموی شہزادہ تھا، اسپین میں اپنے خاندان کی آزاد حکومت قائم کر لی - صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ایک اہم صوبہ مرکز سے کٹ گیا بلکہ ایک حریف خلافت قائم ہو گئی جس نے بڑی شان و شوکت پیدا کی اس کو خلافت کا مقام دینے والا عبدالرحمٰن ثالث تھا۔

خود ہاشمیوں میں بھی تصادم واقع ہوا۔ اس میں عباسی ایک طرف تھے اور علوی دوسری طرف - یہ ملت کے اتحاد کے لئے تباہی تھی۔ علویوں نے بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ ان کے چچا زاد بھائیوں نے جو عباسی تھے ان کو دھوکہ دیا اور اس لئے متواتر بڑے جوش اور قوت سے وہ اپنی خلافت کا دعوے منوانے کے لئے کھڑے ہو گئے - اگرچہ ہر مرتبہ ان کو شکست ہوئی لیکن علوی

عباسیوں کی خلافت پر کبھی راضی نہیں ہوئے اور ان کی حکومت کے خلاف مسلسل بغاوت کرتے رہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اب عباسیوں نے علویوں کے خلاف جور و ظلم کی پالیسی اختیار کی، مگر بہر حال مجموعی طور پر اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ علوی مصر میں ایک جداگانہ اور خود مختار فاطمی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دولت مشترکہ اسلامیہ کی مزید قطع و برید واقع ہوئی۔ ان حالات میں عباسیوں کے لئے صرف ایک ہی راہ باقی رہ گئی اور وہ انہوں نے اختیار کی۔ انہوں نے اپنی خلافت کو مذہب کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ اس طرح وہ ملک کی تقسیم اور باہمی رقابت کے باوجود باقی رہ سکے۔ اس منصوبے کی تنظیم منصور نے کی اور اسی وجہ سے وہ صحیح طور پر خلافت عباسیہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

منصور خود بڑا عالم تھا، دینی علوم پر اس کو پورا عبور تھا۔ اس نے علما کی سرپرستی کی اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر کے لوگوں کے دلوں پر یہ اثر قائم کیا کہ وہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضؓ کی اولاد میں ہیں اس لئے خلافت کے جائز حق دار ہیں۔ اس طریقے پر منصور اپنے خاندان کی مستقل اور پختہ بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام ہونے کی وجہ سے کہ خلیفہ حضرت عباسؓ کے خاندان سے منتخب ہونا چاہیئے، عباسیوں کے ہاتھ سے دنیوی اختیار جانے کے بعد بھی ان کی خلافت صدیوں قائم رہی۔ یہاں تک کہ ۶۵۶ھ میں کافر مغلوں نے اسے تباہ کیا۔

چونکہ فارس کے نومسلموں کی مدد سے عباسیوں کو اقتدار حاصل ہوا تھا اور وہ امویوں کی عرب حکومت کے مقابلے میں اسلامی حکومت کے

حامی تھے اس لئے یہ ان کے لئے طبعی بات تھی کہ معاشی، سیاسی اور ثقافتی امور میں وہ موالیوں کے ساتھ برابر کا برتاؤ کریں۔ انہوں نے اس کے لئے راستہ کھول دیا کہ وہ حکومت کے بڑے سے بڑے عہدے حاصل کریں۔ اب وزارت بھی ان کی دسترس کے اندر تھی۔

امیر علی لکھتا ہے کہ اس وقت سے غیر عرب لوگوں کو اس عظیم مہذب سلطنت میں بحیثیت مشترکہ رعایا ان کا یہ واجبی مقام حاصل ہوا کہ وہ اسلام کے شہری تھے۔ حکومت و دولت کے بڑے سے بڑے عہدے پر لئے گئے اور عربوں کی برابر سمجھے گئے۔ سوائے زمانہ رسالت و خلافت راشدہ عہد حاضر یا قدیم کی تاریخ میں اس سے بڑا انقلاب کبھی نہیں دیکھا گیا اس سے انسانی اخوت اور مساوات کا جمہوری اصول عملاً نافذ ہو گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عباسی خلافت میں کیا زور تھا اور اس کا دینی اختیار اعلے کیسا مستقل تھا کہ دنیوی اقتدار جاتے رہنے پر بھی قائم رہا۔

یہ بنیادی اصول تسلیم کر کے کہ رعایا کے سب لوگ برابر ہیں خواہ وہ کسی نسل سے ہوں۔ خاندان عباسیہ کے ابتدائی فرماں رواؤں کو وہ پالیسی تعبیر کرتے ہیں مدد ملی جو پانچ صدی تک اس طرح قائم رہی کہ ان کا کوئی حریف نہ تھا اور صرف اس وقت اس کا سقوط واقع ہوا کہ وحشیوں نے باہر سے حملہ کیا۔

نومسلموں کو سلطنت میں برابر کے حقوق دے کر اور سب کے لئے یکساں قانون شریعت نافذ کر کے عباسیوں نے اسلامی دولت کے لئے نئی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔

مسئلہ جانشینی

خلافت کے انتخابی عناصر اسی طرح عباسی عہد میں بھی معطل رہے جس طرح اموی عہد میں تھے اور وہی موروثی جانشینی کا ناقص طریقہ جاری رہا۔ خلیفہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کو خلافت کے بلند اور ذمہ دار عہدے کے لئے نامزد کرتے رہے اور بعض نے دو دو اور تین تین ولیعہد نامزد کئے جس سے حالات اور زیادہ خراب ہوئے اور وراثت کیلئے جنگوں کی نوبت آئی۔ وراثتی جانشینی کا یہ فطری تقاضہ ہے کہ جانشینوں میں پستی آئے۔ اسی وجہ سے یہ ہوا کہ حقیقی لحنیا اقتدار عباسیوں کے ہاتھ میں صرف تقریباً ایک صدی رہا، لیکن چونکہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ عقیدہ بٹھا دیا گیا تھا کہ خلیفہ صرف حضرت عباس رضؓ ہی کے گھرانے کا ہونا چاہیئے اس لئے وہ اپنی حکومت کو طول دے سکے۔ اس خاندان کی سب سے بڑی سیاسی غلطی یہ تھی کہ اس نے یہ وراثتی طریقہ جانشینی جاری رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد خلافت کی عالمگیر حیثیت ختم ہو گئی تھی اور صرف یہی ایک صورت ممکن رہ گئی تھی کہ خلیفہ خاندانی بنیاد پر منتخب ہو مگر پھر بھی عباسیوں کو چاہیئے تھا کہ جس طرح حضرت عمر رضؓ نے انتخاب کرنے والوں کی ایک جمعیت نامزد کر دی تھی اسی طرح یہ بھی کوئی ایسا طریقہ نکالتے کہ ہر جانشینی کے موقع پر عباسیوں ہی میں سے ایک مجلس نامزد کی جایا کرتی جو بہترین شخص کو عہدۂ خلافت کے لئے چنتی۔ اس سے یہ ہوتا کہ جب تک ان کو لوگوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہتا وہ، موجودہ زمانے کی ان جمہوری حکومتوں کے طریقے پر جو سیاسی پارٹیوں سے چلتی ہیں، باقی رہتے۔

بیعت

مگر پھر بھی یہ ناقص وراثتی طریقہ جانشینی ایسا صاف اور سادہ نہیں تھا جیسا کہ اس وقت کی دوسری حکومتوں میں تھا۔ خلیفہ اپنے جانشین کو نامزد ضرور کرتا تھا لیکن اس کا حق ولیعہدی خلیفہ کی نامزدگی پر نہیں بلکہ اس بیعت پر مبنی ہوتا تھا جو لوگ اس کے ہاتھ پر کرتے تھے۔ یہ اصول ہمیشہ تسلیم کیا گیا کہ خلیفہ کا انتخاب ہونا چاہیئے اور وہ صرف اس وقت تک اس عہدے پر قائم رہے جب تک کہ اس کا طرز عمل صحیح رہے لیکن کوئی ایسا نظام پیدا نہیں ہو سکا اور اس وقت جو معاشرے کی حالت تھی، اس میں ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ فرمانروا کی ہر تبدیلی پر کروڑوں مسلمانوں کے ووٹ (رائے) لئے جا سکتے۔ تاہم نئے خلیفہ کے لئے بیعت لی جاتی تھی۔ مرکز میں خلیفہ خود اپنے ہاتھ پر بیعت لیتا تھا اور صوبوں میں گورنر اس کے نمائندوں کی حیثیت سے۔ بقول امیر علی: "منتخب خلیفہ کے حق میں بیعت ایک دینی سند تھی اور اس سے اس کی ذات میں ایک قسم کا تقدس پیدا ہو جاتا تھا۔ بیعت کو جو دینی سند کی حیثیت حاصل تھی وہ مندرجہ ذیل خیال پر مبنی تھی۔ تمام قواعد اور قوانین جنکو عامتہ المسلمین کی تائید حاصل ہو وہ اللہ کی آواز ہیں۔ یہ خلاصہ اجماع امت، یعنی عامتہ المسلمین کا اتفاق رائے ہے، اور جب وہ متفقہ طور پر کسی کو دینی رہنما چنیں یا مسلمانوں کی جماعت کا سردار بنائیں تو اس کے دینی اختیار کو اللہ کی منظوری حاصل ہو جاتی ہے، اور وہ جائز حکومت کا معدلہ منبع ہو جاتا ہے اور اس کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ حکومت کرنے کے لئے خدمات میں فیصلے کرنے کے لئے اور نمازوں میں امامت کرنے کے لئے

اپنے نائب مقرر کرے۔ یہ خلیفہ کے انتخاب کی اسی دینی نوعیت کی وجہ سے ہوا کہ جب خلیفہ کے ہاتھ میں دینوی اقتدار کا کوئی شمہ باقی نہیں رہا اور اس حالت میں اس کو عرصہ دراز گذر گیا تب بھی محمود غزنوی جیسے سلاطین اور فاتح تبرکاً اس سے سند اختیار کے لئے درخواست کرتے تھے۔ خلیفہ کی تصدیق سے ان کا اختیار جائز ہو جاتا تھا اور ان کی ریاستوں اور دولتوں کی حکمرانی کا شرعی یا قانونی حق انہیں حاصل ہو جاتا تھا اور ان کے خلاف ہر بغاوت غیر شرعی اور گناہ قرار پاتی تھی۔ یہ رسم عطائے اختیار اس طرح عمل میں آتی تھی کہ خلیفہ ایسے سلاطین یا سرداروں کو باضابطہ سند سلطانی دیتا تھا جس کے ساتھ عموماً جواہرات تلواریں اور پرچم ہوتے تھے۔

جس طرح لوگوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریں اور اس کے انتخاب کی تصدیق کریں اسی طرح اس کے مقابلے کا یہ حق بھی ان کو حاصل تھا کہ اگر خلیفہ برملا قانون شریعت کی خلاف ورزی کرے تو اس کو معزول کر دیں۔ اس معاملے میں بھی لوگوں کی وہی چھوٹی سی جماعت پیش قدمی کر سکتی تھی جو سب سے پہلے بیعت کرتی تھی جیسے مذہبی پیشوا، قاضی سالاران فوج اور دوسرے بڑے عمال اس کے بعد عام لوگ اس فیصلے کی تصدیق کرتے تھے۔

خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں جب خلفاء کو یہ آزادی حاصل تھی کہ جس کو چاہیں اپنا ولیعہد منتخب کریں اور ایسے لائق جانشین منتخب ہوئے جن میں کردار بھی تھا اور قابلیت بھی، اکثر یہی ہوا کہ کم عمر یا کم لیاقت بیٹے کو نظر انداز کر کے خلیفہ کے بھائیوں میں جو سب سے بڑا ہوتا تھا وہی جانشین نامزد کیا جاتا تھا۔

خلافت کی امتیازی علامتیں

ابتدائی دور میں خلافت کی علامتیں یہ تھیں:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر، عمامہ اور انگشتری۔ اپنی مسند نشینی اور دوسرے خاص مواقع پر انہیں خلیفہ استعمال کرتا تھا۔ ان کے بعد سب سے زیادہ اہم علامت یہ پیدا ہوئی کہ خلیفہ کا نام خطبے میں داخل کیا گیا۔

خطبہ

جیسا کہ بار بار بیان ہوا خلیفہ نماز جماعت کا مستقل اور مسلمہ امام ہوتا تھا۔ وہ واقعی دارالخلافت کی بڑی مسجد میں پنج وقتہ نماز پڑھاتا تھا جمعے اور عیدین کی نمازوں میں امامت کرتا تھا اور خطبہ دیتا تھا۔ اسی حیثیت کی بنا پر وہ خلافت کی تمام قلمرو کی مسجدوں کے لئے امام مقرر کرتا تھا جو اللہ اور رسولؐ کے ذکر کے بعد خلیفہ وقت کا نام لیتا تھا۔ اس طرح خطبے میں خلیفہ کی حیثیت سے کسی کا نام ہونا اس کی علامت تھا کہ جماعت مسلمین نے اس کو سردولت تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ شروع میں یہ محض ایک مذہبی عمل تھا لیکن بعد میں اس کو بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی

سکہ

عہد خلافت عباسیہ میں خلیفہ کا یہ خصوصی امتیاز ہو گیا کہ سکے پر اس کا نام کندہ ہو۔ بعد میں والیوں کے نام بھی سکے پر کندہ ہونے لگے لیکن پھر بھی اس کی دوسری طرف خلیفہ کا نام ضرور ہوتا تھا۔

پروانہ تقرر کی منظوری خلیفہ کا نہایت ہی اہم سیاسی امتیاز تھا جو محض اسی کے لئے مخصوص تھا۔ چونکہ تمام اختیارات کا مصدر و منبع خلیفہ تھا اس لئے کسی والی کا تقرر اس وقت تک جائز تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جب تک وہ خلیفہ سے پروانہ تقرری حاصل نہ کر لے۔ خلیفہ سے پروانہ تقرری لینا والیوں اور دوسرے عمّال کی طرف سے اس کا اقرار ہوتا تھا کہ سیاسی حیثیت سے وہ خلیفہ کے تحت اختیار ہیں اور خلیفہ یا گورنر کی موت پر پروانہ تقرری کی تجدید ان پر خلیفہ کے اختیار کی مزید علامت تھی۔

خلیفہ کا صرف خاص

صرف معینہ وظیفہ ہی نہیں بلکہ خلیفہ کو غنیمت میں سے بھی ایک حصہ ملتا تھا، اور یہ وہی تھا جو رسول اللہ علیہ وسلم اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرتے تھے۔ خلفائے راشدین نے یہ لینا بند کر دیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں نے اس کی اپنے حق میں اس وجہ سے تجدید کر لی کہ وہ حضرت عباس رضؓ کے واسطے سے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، آپ کے رشتہ دار تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس بہت بڑی شاہی جائدادیں تھیں، جن کے انتظام کے لئے ایک جداگانہ محکمہ قائم کرنا پڑا۔ جس کا نام دیوان الدیاہ تھا۔

عدالت

ایوان عدالت پر فارسی طور و طریق کا بڑا اثر تھا اور ایرانی بادشاہوں کے طرز پر اسے ترقی دی گئی۔ مگر صرف یہ ایک فرق تھا کہ شاہان فارس سات

پردوں میں چھپ کر بیٹھتے تھے اور خاص تقریبات کے موقعوں پر عوام کو زیارت کا موقع دیتے تھے۔ عباسی خلیفہ مسلمان تھے اس لیے جمعے کی نماز میں امام ہوتے تھے اور عدالت مظالم منعقد کرتے تھے تاکہ لوگوں کی شکایات کی خود تحقیقات کریں۔ اس طرح ہر شخص کی ان تک رسائی تھی مگر پھر بھی تہذیب و تمدن کی ترقی کے اثرات اس قدر غالب ہو گئے تھے کہ عباسی خلفاء کا دربار ویسا سادہ اور قبائلی شیوخ کا سا نہیں رہا تھا جیسا امویوں کا تھا بلکہ اس میں بڑے مراسم اور تکلفات آ گئے تھے۔

خلیفہ کے درباریوں کی فہرست میں حسب ذیل لوگ ہوتے تھے :۔

خلیفہ کے کنبے کے شہزادے، قصر خلافت کے عہدہ دار، خلیفہ کے موالی (یعنی آزاد کردہ غلام) محافظ، معتمد خاص (خلیفہ کے خصوصی کاتب) قاری محدثین، منجمین، جلاد، وہ افسر جو گھڑیوں کے نگران تھے، قصہ گو، مسخرے فوجی سردار، شکاری، باز دار، الحبابہ، درباری کشتیوں کے عہدہ دار وغیرہ۔

زمانہ حاضر کی طرح ایسے لوگوں کی ایک فہرست تھی جن کو خلیفہ خاص مواقع پر کھانے کے لئے مدعو کرتا تھا۔ اس میں اہل علم و فضل، درباری اور قائدین فوج تھے۔

دربار کے رکھ رکھاؤ پر بہت بڑی رقم خرچ ہوتی تھی صرف باورچیخانے کے لئے دس ہزار دینار ماہانہ الگ کر دیا جاتا تھا۔

عباسیوں کا خاص رنگ سیاہ تھا۔ ان کے جھنڈے کا رنگ بھی سیاہ جس پر سفید رنگ میں یہ لکھا رہتا تھا: محمد الرسول اللہ۔ مسند نشینی کی رسم میں اب بھی عربی سادگی باقی تھی۔ خلیفہ سیاہ خفتان پہنتا، اور سیاہ عمامہ

باندھتا تھا - اس کے اوپر رِدائے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی تھی اور ہاتھ میں آپ ہی کا عصا - خلیفہ کے سامنے قرآن کا وہ نسخہ رکھا جاتا تھا جو حضرت عثمان رضؓ نے مرتب کیا تھا - پہلے امرائے دربار اور ان کے بعد دیگر لوگ ایک ایک کر کے آتے اور خلیفہ کے ہاتھ کو بوسہ دیتے تھے - یہ بیعت کا طریقہ تھا -

شورے

قرآن کے صاف احکام کے مطابق عباسی خلفاء نے یہ کوشش کی کہ امورِ حکومت کا انصرام باہمی مشورے سے ہو - عباسیوں کے ابتدائی عہدِ خلافت میں حکمران عباسی کنبے کے لوگ اور ان خاندانوں کے لوگ جو اس خاندان کی حکمرانی و خلافت کے حامی تھے، جیسے برمکی، خلیفہ کے مشورے میں شریک رہتے تھے -

مامون ان میں وہ پہلا خلیفہ تھا جس نے باضابطہ مجلس شورے قائم کی جس میں ہر اس جماعت کے لوگ شریک تھے جو اس کے دائرہ اطاعت میں داخل تھی - مگر یہ صرف ایک مثال تھی اور اس وقت کے حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی ایسی مجلس شورے قائم کی جائے جس میں جماعت مسلمین ہی کے تمام فریقوں کی نیابت ہو، کیونکہ علوی اور خارجی عباسی خلیفہ کی ہمیشہ مخالفت کرتے تھے اور ان سے مصالحت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی - مگر چونکہ بہت سے دیوان قائم ہو چکے تھے اور سر دیوان الگ کوئی وزیر ہوتا تھا اس لئے یہ معمول ہو گیا کہ خلیفہ محکمہ متعلقہ کے افسر اعلےٰ سے مشورہ کرتا تھا اور اس طریقے پر مجلس شورے کا مقصد ایک طرح پورا ہو جاتا تھا -

خلیفہ اور وضع قانون

امویوں کے زمانے سے قانون وضع کرنے (یا فقہی مسائل میں فیصلے دینے) کا کام خلیفہ یا جلاس مجلس شوریٰ کے اختیار میں نہ رہا اور وہ علمائے وقت جو فقہ میں ماہر تھے یہ خدمت انجام دینے لگے۔ مگر پھر بھی قانون کے ماخذ وہی رہے جو پہلے تھے یعنی: ۱۔ قرآن ۔ ۲۔ حدیث، ۳۔ اجتہاد اور اجماع۔ قانون وضع کرنے میں سہولت پیدا کرنے کے لیے آیات قرآنی کے معنی، کم و بیش قطعی طور پر معین کر دیئے گئے اور خلفائے عباسیہ کے ابتدائی عہد میں بڑی کثرت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں جمع کی گئیں اور ان کو ترتیب دیا گیا۔ فقہ اسلامی کی مزید تدوین کی گئی، اور فقہ کے چار عظیم اماموں اور ان کے متبعین نے مختلف مذہبی فرائض اور نیز دنیوی امور کے متعلق ضوابط معین کر دیئے۔ قانون کے متعلق جو فوری ضروریات تھیں وہ اس طرح پوری ہو گئیں۔

خلیفہ اور عدلیہ

عہد خلافت عباسیہ میں عدلیہ نے مزید ترقی کی۔ اب تک خلیفہ یا والیان صوبجات بحیثیت نمائندہ خلیفہ قاضی مقرر کرتے تھے، لیکن خلیفہ مہدی کے زمانے سے قاضی القضاۃ کا عہدہ بھی قائم کیا گیا اور شعبہ عدل کے تمام کام اس کے سپرد کر دیئے گئے۔ یہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہوا کہ پوری قلمروئے خلافت میں قاضیوں کا تقرر کرے جو راست اسی کو جوابدہ ہوتے تھے۔ انتظام امور عدالت میں قاضیوں کو مدد دینے کے لیے افسروں

کا ایک اور طبقہ پیدا کیا گیا جن کو عادل کہتے تھے یہ ایسے ہی تھے جیسے دور حاضر کے پبلک نوٹری ہیں۔ پہلے صرف ان گواہوں کی شہادت قبول کی جاتی تھی جو ثقہ مشہور ہوتے تھے۔ دوسرے۔ مسترد کر دیے جاتے تھے یا ان کے ہمسایوں سے ان کے اطوار کے متعلق تحقیقات کی جاتی تھی۔ لیکن خلیفہ منصور کے زمانے سے ایسے لوگوں کی ایک مستقل فہرست رکھی جانے لگی جو گواہی دینے کے لئے ہر طرح مستعد ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ثقاہت ہی نہیں بلکہ گواہوں کی فہرست میں نام درج ہونا اس کی سند ہو گئی کہ کوئی شخص اس قابل ہے کہ اس کی شہادت قبول کی جائے۔ انہی گواہوں میں سے قاضی بعض کو اپنی مدد کے لئے اسیسر مقرر کر دیتا تھا، اور جب قاضی اپنے عہدے سے الگ ہوتا تھا تو اس کے مقرر کئے ہوئے اسیسر بھی اسیسری سے الگ ہو جاتے تھے۔

قاضی انتہا درجے کے صاحب صلاحیت، لائق اور ذمہ دار اشخاص ہوتے تھے اور مندرجہ ذیل اوصاف ان میں ہوتے ضروری تھے :-

۱۔ فقہ اسلامی کا راسخ علم

۲۔ بے داغ چال چلن

۳۔ دماغی قوتیں پوری پوری اور بینائی اور سماعت بالکل صحیح۔

۴۔ آزاد ہوں، مرد ہوں اور مسلم شہری ہوں۔

قاضیوں کے خاص فرائض حسب ذیل تھے :-

۱۔ تنازعات کا فیصلہ اور استقرار حقوق۔

۲۔ نابالغوں اور لایعقلوں کی جائدادوں کا انتظام، اوقاف کی نگرانی اور وصیتوں کا نفاذ۔

۳۔ بیوہ عورتوں کے نکاح کی ترغیب دینا اور ان کے نکاح کا انتظام کرنا

اور حدود جاری کرنا۔

۴۔ عوام کی طرف سے (سرکاری املاک پر) دست درازیاں رفع کرنا۔

۵۔ اپنے ماتحتوں پر قابو رکھنا اور ان کے چال چلن پر نظر رکھنا۔

قاضیوں کا کام یہ تھا کہ فیصلہ دیں اور اس کے فیصلوں کی تعمیل کرنا عاملوں کا کام تھا۔

چونکہ فقہ اسلامی (قانون شریعت) کی تدوین ہو چکی تھی اس لیے تمام قلمروئے خلافت میں قانون اور ضابطہ کارروائی میں یکسانیت قائم ہو گئی اور اس طرح قاضیوں کو اس عہد میں قانون کے مفہوم و تعبیر اور ضابطہ کارروائی کے متعلق بہت ہی کم اختیار باقی رہ گیا۔

چونکہ قاضی کی عدالت ایک مذہبی ادارہ سمجھا جاتا تھا جہاں بلا تمیز و مرتبہ و نسل و صنف و قوم سب پر قانون شریعت منطبق ہوتا تھا اس لیے کوئی شخص حتیٰ کہ وہ بھی جو ریاست اسلامیہ میں سب سے بڑا ہو نہ ترجیحی برتاؤ حاصل کر سکتا تھا اور نہ اس کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ ایسی کئی مثالیں ہیں جن میں خلیفہ کو بذات خود مدعا علیہ کی حیثیت سے قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا اور اس کے ساتھ کوئی ترجیحی برتاؤ نہیں کیا گیا۔

فوجداری کے مقدمات میں انصاف کے لئے خلیفہ کی عدالت سب سے اونچی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین خلافت کی قلمرو کی تمام حصوں کی اپیلیں (مرافع) سنتے تھے اور لوگوں کی تمام شکایات کی تحقیقات کرتے تھے۔

اموی اور عباسی خلفاء نے یہ روایت قائم رکھی اور ہفتے میں ایک خاص دن اس کام کے لیے مقرر کیا۔ اس روز ہر معمولی آدمی خلیفہ تک پہنچ سکتا تھا

اس ادارے کا کام یہ تھا کہ انتظام یا عدل کے محکموں میں جو ناانصافیاں ہوئی ہوں انہیں رفع کریں اور اگر کسی کی طرف سے کوئی استغاثہ بھی نہ ہو تو سرکاری طور پر کاروائی کریں۔

ماوردی کے بیان کے مطابق اس ادارے کے فرائض حسب ذیل تھے:

(۱) عوام کے ساتھ حکام عاملہ کے ظالمانہ طرز عمل کی تفتیش اور اگر کسی کی طرف سے کوئی استغاثہ نہ ہو تب بھی سرکاری طور پر کاروائی شروع کرنا۔

۲۔ ان افسروں کی نگرانی جو مالیات یا محصولات اور عدالت عالیہ سے متعلق ہوں۔

۳۔ اس کی نگرانی کہ افواج کی تنخواہیں واجبی طور پر ادا ہو گئیں۔

۴۔ ایسی املاک کی واپسی جو انصاف کے خلاف حاصل کی گئی ہوں،

اور

۵۔ اوقاف وغیرہ کی جائیدادوں کی نگرانی۔

اس دیوان کے صدر کا مرتبہ قاضی کے مرتبے سے کہیں زیادہ بلند تھا" کیونکہ قاضی اس کی نگرانی میں کام کرتا تھا اور اس سے ہدایات حاصل کرتا تھا صدر کو یہ اختیار تھا کہ وہ خود قانونی تنازعات کا فیصلہ کر دے یا انہیں فیصلے کے لئے قاضی کے پاس بھیج دے یا ثالثوں کے حوالے کر دے۔ یہ صدر اپنے فیصلوں میں قاضی کی طرح الفاظ قانون کا سختی سے پابند نہیں تھا۔ وہ فریقین کے گواہوں کے بیانات سن سکتا تھا۔

اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ الفاظ قانون کے مطابق نہیں بلکہ اصول انصاف کے مطابق فیصلہ دیتا تھا۔

محتسب

یہ خلفائے عباسیہ کے عہد میں ہوا کہ محتسب کا باضابطہ عہدہ قائم کیا گیا۔ یہ عہدہ صدر نظارۃ مظالم اور قاضی کے درمیان تھا۔ اس کا خاص فریضہ اس کی نگرانی تھا کہ اسلام کے مذہبی اور اخلاقی احکام کی پابندی ہو، اور جرائم کا سراغ لگانا اور مجرموں کو سزا دینا۔ محتسب کے اصل فرائض یہ تھے کہ عوام کے اخلاق کی حفاظت، اور تجارتی بدا عمالیوں کا سدباب کرئے۔ علی الاعلان جب کوئی جرم واقع ہو جاتا تھا تو محتسب دست اندازی کر سکتا تھا لیکن وہ نہ لوگوں کے رازو اسرار کی جستجو کر سکتا تھا اور نہ شائستگی کی حدود سے تجاوز کر سکتا تھا۔

ماوردی لکھتا ہے کہ محتسب دو قسم کے ہوتے تھے:۔ رضاکار اور سرکاری تنخواہ دار۔ ان کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ بازاروں کے نگراں کی حیثیت سے محتسب روزانہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ شہر کا گشت کرتا تھا، سب چیزیں دیکھتا تھا کہ ان میں ملاوٹ تو نہیں ہے، باٹوں کا اور ناپنے کے جو پیمانے تھے ان کا معائنہ کرتا تھا۔ اس کے فرائض یہ تھے کہ ناگوار یا نفرت انگیز باتوں کے وقوع کو روکے، سرکاری سڑکوں پر جو رکاوٹیں پیدا کی گئی ہوں یا دست درازی کی گئی ہو انہیں ہٹائے، دوسروں کی زمین میں لوگوں کو اپنے مُردے دفن کرنے سے روکے، نوکروں اور جانوروں پر ظلم کو روکے، مقروضوں کو مجبور کرے کہ قرضہ ادا کریں، پابندی سے مسجدوں میں نماز کی ترغیب دے، رمضان میں سب کے سامنے کھانے پینے کی ممانعت کرے، بیوہ اور مطلقہ عورتوں پر عدت نافذ کرے۔ غریب کنواری لڑکیوں اور بیواؤں کی شادی

کی ترغیب دے، منظر عام پر مردوں کو عورتوں سے بے تکلفی کی ممانعت کرے، کسی کو اگر شراب کے نشے میں پائے تو اس کو دُرّے لگوائے، نیز کھیلوں کی نگرانی وغیرہ۔

محتسب صرف ان مقدمات کا سرسری فیصلہ کر سکتا تھا جن کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوتا۔ ایسے مقدمات جن میں شہادت اور حلف کی ضرورت ہوتی وہ قاضی کی عدالت میں جاتے تھے۔ محتسب کا کام قاضی اور دیوان نظارۃ مظالم کے درمیان ہوتا تھا، لیکن مرتبے اور اختیار میں یہ دونوں سے کم تھا۔

بہرکیف محتسب کوئی طاقتور آدمی ہوتا تھا اور خطا کاروں کے ساتھ درشتی اور غیر جانبداری سے پیش آنا اس کا کام تھا۔ دولت اسلامیہ کی حدود کے اندر اگر کوئی اسلامی ضابطہ اخلاق کی برملا خلاف ورزی کرتا، تو وہ خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہوتا، محتسب کی سزا سے نہیں بچ سکتا تھا۔

چونکہ یہ اسلامی ریاست تھی اس لئے غیر مسلموں پر اسلامی شریعت نافذ نہیں تھی۔ غیر مسلموں کے باہمی تنازعات انہی کی مذہبی عدالتوں کے لئے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ لیکن انسانیت کے خلاف جو جرائم ہوتے تھے جیسے زنا، قتل، چوری، ڈکیتی، مارپیٹ وغیرہ تو وہی قانون جو مسلمانوں کے لئے تھا غیر مسلموں کے لئے بھی تھے جب مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان تنازعہ ہوتا تو مقدمہ قاضی کی عدالت میں جاتا تھا اور وہ اس اصول کی بنا پر: "اس دنیا کے معاملات میں ذمی بالکل ایسا ہی ہے جیسا مسلمان"

خلیفہ اس دولت میں عامل اوّل و اعلیٰ تھا۔ اس کی نظر اس پر رہتی تھی کہ

قوانین کی پابندی ہو۔ وہ مدنی اور فوجی انتظام کے تمام عمال، حکام اور اہلکاروں پر راست یا بالواسطہ اختیار رکھتا، اعلان جنگ کرنا اور صلح کرنا تھا۔ ملک کا مالیہ اس کے دست قدرت میں تھا اور وہ قانون شریعت کے مطابق اسے جمع اور خرچ کرتا تھا۔ اس کو اختیار تھا کہ کوئی علاقہ دے ڈالے اور کسی غیر دولت کو روپیہ ادا کرے۔

تمام خارجی تعلقات اسی کے اہتمام میں تھے اور تمام سفراء اور سفارتی کارپردازوں کو اسی سے ہدایات ملتی تھیں۔ عباسیوں کے ماتحت انتظام حکومت ایسے ہی معین خطوط پر چلتا تھا جیسا عہد حاضر کے ان انتظامی نظاموں میں جنہیں مہذب کہتے ہیں۔ بعض باتوں میں وہ اس زمانے سے آگے تھا۔ حکومت کو خوبی سے چلانے کے لئے کئی دیوان قائم کئے گئے، تو جو ہمارے زمانے کے محکموں کے مشابہ تھے، اور مرکز اور صوبوں میں ان کا انتظام کرنے کے لئے ایسے لوگوں کو ان کا افسر اعلےٰ مقرر کیا گیا تھا جو بڑے لائق اور کارشناس مہارت والے تھے۔ تمام ملک کے نظام انتظامی کو ایک مرکز کے تحت میں لانے کے لئے اس عہد میں وزیر اعظم کا عہدہ بھی ایجاد کیا گیا۔

وزارت

سیاسی تاریخ کی بالکل ابتدا سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ نظام وزارت موجود تھا۔ بہت بڑی حکومت کا بار چونکہ ایک شخص اچھی طرح نہیں اٹھا سکتا تھا اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی مدد کرنے اور اس کی ذمہ داریوں میں شریک ہونے کے لئے کوئی معاون چاہیئے۔

مسلم علماء اس پر متفق ہیں کہ لفظ وزارت کا اصل عربی ہے ۔ اس

لفظ کے عربی مادوں کے متعلق ماوردی لکھتا ہے :- اوّل یہ ہے کہ یہ الوزر سے نکالا گیا ہوگا، جس کے معنے ہیں بوجھ، کیونکہ وزیر حکومت کا بوجھ یا ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے۔ دوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ الوزر سے نکلا ہو۔ الوزر کے معنے ہیں سایہ۔ اس کو وزیر اس لئے کہا گیا ہے کہ فرمانروا وزیر کے مشورے اور مدد کے سائے میں رہتا ہے۔ سوم یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اُزر سے نکلا ہو۔ اُزر کے معنے ہیں کمر۔ وزیر فرمانروا کو اپنی تائید و حمایت سے اسی طرح قوت دیتا ہے جس طرح جسم کو کمر سے قوت پہنچتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیر بمعنے مددگار۔ عربی زبان میں عام طور سے بولا جاتا تھا، اور انہی معنیٰ میں قرآن نے دو مرتبہ حضرت ہارون کو حضرت موسےٰ کا وزیر کہا ہے۔ وزیر کا عہدہ خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں باضابطہ موجود نہیں تھا۔ یہ عباسیوں نے شروع کیا، پہلا شخص جس کو یہ خطاب ملا ابو سلمتہ الخلال تھا۔ یہ شخص کوفے میں عباسیوں کی دعوت کی تبلیغ کرتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا مشہور وزیر تھا۔

اس کے بعد خالد بن برمک کا، جو ایک شریف خاندان شخص تھا اور عباسی انقلاب کا لیڈر بھی، سفاح نے اس عہدے پر تقرر کیا۔ اگرچہ خالد نے وزیر کی خدمات انجام دیں لیکن اس نے اس خوف سے اپنے کو وزیر نہیں کہا کہ مبادا وہی انجام اس کا بھی ہو جو ابو سلمہ کا ہوا تھا۔

ہارون الرشید کے عہد تک وزیر داخلی طور سے فرمانرواؤں کے اختیار میں رہے۔ ان کو محدود اختیارات دیئے جاتے تھے اور عوام اور فرمانروا کے درمیان وہ واسطے کی خدمت انجام دیتا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ ہارون الرشید نے مدنی انتظام کے اختیارات برمک وزرار کو دیئے۔ یہ وزیر حقیقی معنےٰ میں خلیفہ

کے اختیارات اور امتیازات بڑھنے لگے۔ وہ سوائے ان کے جن کا راست خلیفہ تقرر کرتا تھا باقی ہر عہدہ دار کو مقرر اور برخاست کر سکتے تھے۔ وہ قاضی القضاۃ کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے اور ماتحت عدالتوں کے تمام اپیلیں سنتے تھے۔ خلیفہ کو وزرار پر پورا اعتماد تھا اور اس سے خوش کہ اس کا بہت سا بار قابل اعتماد وزرار نے اٹھا لیا اور وہ اپنا زیادہ وقت دوسرے فرائض اور مشاغل میں صرف کرتا تھا۔

کہتے ہیں ہارون الرشید نے یحییٰ بن برمک سے یہ کہا کہ "میں اپنی رعایا کی ذمہ داری تجھ پر چھوڑتا ہوں فیصلے تو چاہے کر اور جس طرح تیرا جی چاہے دولت خرچ کر ان معاملات میں میں تیرے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔" کچھ عرصے کے بعد حکومت کے تمام دیوانوں کی نگرانی یحییٰ کے سپرد کر دی گئی اور مہر خلافت بھی اسی کے حوالے ہوئی۔

خلیفہ کو جعفر سے ایسی محبت تھی کہ اس نے اس کو سرکاری طور پر اپنا بھائی کہا، تمام صوبوں کی دارالضرب میں اس کے انتظام میں رہیں اور یہ اختیار دیا کہ سکے پر خلیفہ کے ساتھ اپنے نام کا اضافہ کرے۔ مگر جب برمکوں نے ایک علوی قیدی کو رہا کر کے خلیفہ کے ساتھ غداری کی اور خلیفہ کے دل میں ان کی طرف سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ وہ عباسیوں سے علویوں میں خلافت منتقل کرنا چاہتے ہیں تو خلیفہ نے جعفر کے قتل کا حکم دیا اور اس کے باپ یحییٰ اور بھائی فضل کو جیل میں بند کر دیا اور ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی۔ برمکوں کے زوال کے بعد وہ وسیع اختیارات جو وزیر کو حاصل تھے دو یا زیادہ آدمیوں پر تقسیم کر دیئے گئے۔

مگر مامون کے زمانے میں ایک اور طاقتور وزیر برسر اقتدار آیا، اس

کا نام الفضل بن سہیل تھا۔ چونکہ یہ اسی شخص کی مدد اور وسائل سے ہوا تھا کہ مامون خلیفہ ہو سکا اور اس وجہ سے اس کو وزارت دی گئی، اور جملہ مدنی اور فوجی اختیارات کے ساتھ، مامون نے ریاست الحرب والتدابیر کے عظیم ترین عہدے پر اس کا تقرر کیا اور ذوالریاستین کا اس کو خطاب دیا۔ یہ سرکش وزیر بھی اپنے حدود اختیار سے آگے بڑھا اور عملاً وہی انجام اس کا بھی ہوا جو برمکوں کا ہوا تھا۔

اس ناگوار تجربے کے بعد مامون کے جانشین نے وزیر کو بہت کم اختیارات دئے، اور اس وزیر کا یہ کام بھی آسان نہ تھا۔ اس کو ایک طرف خلیفہ کو خوش رکھنا پڑتا تھا اور دوسری طرف عوام کو۔ فرمانروا کا اعتماد کھونے کے معنی یہ تھے کہ عہدے سے برخاست اور تمام جائداد ضبط ہو اور کبھی سزائے موت کی نوبت بھی آجاتی تھی۔

اس لئے وزیر کو بڑا محتاط رہنا پڑتا تھا۔ حاسد درباری ہمیشہ اس کے لئے تیار رہتے تھے کہ خلیفہ کے دل میں اس کی طرف سے بدگمانیاں پیدا کریں۔ اس کو مختلف قسم کے معاملات میں خلیفہ کو مشورہ دینا ہوتا تھا۔ اس میں مصاحبت کے تمام کمالات ہونے ضروری تھے اور فرمانرواؤں کی طرف سے اس کے معیار میں ترقی کا مطالبہ تھا۔ ضروری تھا کہ وہ شطرنج اور چوگان خوب کھیلتا ہو، ستار بجانا جانتا ہو اور ریاضی، طب، نجوم، شاعری، صرف ونحو اور تاریخ پر عبور رکھتا ہو اور پھر خوبی کے ساتھ شعر پڑھ سکتا ہو اور داستان گوئی میں ماہر ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مامون نے وزیر کے لئے مندرجہ ذیل اوصاف ضروری قرار دئے تھے۔ میں امور دولت ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں جس میں یہ چند

اچھی صفات ہوں۔ چال چلن میں پاک ہو اور نفس پر قابو رکھتا ہو، روش میں ثبات اور استقلال ہو، ادب کے مطالعے سے اس میں شائستگی اور نفاست ہو، تجربے سے پختگی اور نرمی ہو، جو راز اس کو سونپ دئے جائیں ان کی حفاظت کرے اور جب امور اہم پر وہ مامور ہو تو بصیرت و تدبیر کے ساتھ انہیں عمل کرے، وقار کے ساتھ خاموش رہے۔ اور علم کے ساتھ گفتگو کرے، قسمت پر قانع ہو، پرانے لباس میں خوش رہے، سالار فوج کی طرح اس میں اقدامیت ہو، فلسفی کا سا صبر ہو، عالم کی سی نرمی ہو، فقیہ کی سی سمجھ ہو، جب اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے تو شکر گزار ہو اور برائی کے ساتھ اس کا امتحان لیا جائے تو تحمل کرے، آج کی خوشحالی کو ضائع کرکے کل مایوس نہ ہو، اپنی شیریں زبانی اور حسن اسلوب سے لوگوں کے دل موہ لے۔"

یہ ضابطہ بن گیا تھا کہ خلیفہ ہی وزیر بھی مقرر کرتا تھا اور دیوانوں کے افسران اعلیٰ بھی۔ المقتدر کے پر آشوب زمانے میں یہ ہوا کہ خلیفہ وزیر کا تقرر کرتا تھا اور وزیر مختلف دیوانوں کے افسروں کا۔ چوتھی صدی ہجری میں یہ اور ہوا کہ حکومت کا سب سے بڑا عہدہ دار ہونے کی بنا پر عراق کے طاقتور صوبے کا انتظام بھی وزیر ہی کی سپرد کیا جاتا تھا۔ اپنے سرکاری فرائض کی اہمیت اور حسن سلوک اور پرورش کے وسیع اختیارات کی وجہ سے وزیر کی حیثیت وہی تھی، جو اس وقت وزیر اعظم کی ہے۔ خلیفہ الراضی کے زمانے سے بجائے وزیر کے سلطنت کا سب سے بڑا عہدہ دار امیر الامراء یعنی سپہ سالار اعظم ہونے لگا۔

اس اختیار کو جائز قرار دینے کے لئے جو امیر الامراء نے غصب کر لیا تھا اور نیز اس کے اختیار کو محدود کرنے کے لئے ماوردی دو قسم کی وزارت

کاذکر کرنا ہے یعنی ایک تفویض اور دوسری تنفیذ۔ تفویض وہ ہے جس میں اختیارات عطا کیے گئے ہوں اور جس میں اختیارات فاصلہ محدود ہوں۔ اول الذکر کے متعلق ماوردی لکھتا ہے: وزارت تفویض کی صورت میں امام (خلیفہ) کسی کو امور مملکت کا انتظام کرنے کے لیے اس طرح مقرر کرتا ہے کہ وہ خود اپنی رائے سے کام لے اور اپنے اختیارات تمیزی سے حکومت کے معاملات کا انصرام کرے۔ وہ یہ کہہ کر اس کو از روئے قانون جائز کر دیتا ہے کہ خلیفہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ تمام ذمہ داریاں خود پوری کرے جو اس کو سونپی گئی ہیں۔ لہذا یہ بالکل فطری امر ہے کہ وہ اپنے نائب مقرر کرے۔

اس (نائب کے) اختیارات کے متعلق ماوردی کی یہ رائے ہے کہ وہ امام سے آزاد ہو کر امور قومی کا انتظام کر سکتا ہے۔ وہ خود مقدمات کا فیصلہ کر سکتا ہے اور اسی طرح قاضی مقرر کر سکتا ہے جس طرح امام کرتا ہے۔ اس کو یہ اجازت بھی ہے کہ اس کام کی انجام دہی کے لئے نائب مقرر کرے۔ وہ خود بھی جہاد کر سکتا ہے اور اس کام کے لئے کسی کو مامور بھی کر سکتا ہے۔ وہ خود انتظامی امور انجام دے سکتا ہے یا اپنے کسی کارپرداز کے سپرد یہ کام کر سکتا ہے۔ جو کام امام کر سکتا ہے وہی کام سوائے تین کاموں کے اس قسم کا وزیر بھی کر سکتا ہے :-

(الف) وہ ولیعہد مقرر نہیں کر سکتا۔ (ب) امام کسی شہری کا یہ حق منسوخ کر سکتا ہے کہ وہ امام بنے، وزیر یہ نہیں کر سکتا۔ (ج) وزیر کے کیے ہوئے تقرر کو امام منسوخ کر سکتا ہے۔ مگر جو تقرر امام کرے وہ وزیر منسوخ نہیں کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ وزیر تفویض کے تمام اعمال از روئے قانون جائز ہوتے ہیں اور اس کے تمام احکام کی تعمیل

ہونی چاہیئے۔

وزارت تنفیذ کا اختیار اس سے کم اور اس کی شرائط تھوڑی ہیں، کیونکہ اس کا مدار امام کی رائے اور اس کی انتظامی قابلیت پر ہوتا ہے۔ اس قسم کا وزیر ایک طرف امام اور عوام کے درمیان اور دوسری طرف امام اور گورنروں کے درمیان محض واسطہ ہوتا ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ امام جو حکم دے وہ کرے اور جس امر کے انصرام کے لئے اس سے کہا جائے وہ امام کی طرف سے انجام دے دے۔ وہ گورنروں کے تقرر کا اور جنگ کی تیاریوں کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ گورنر کرتے ہیں وہ سب خلیفہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اگر خلیفہ اس سے مشورہ کرتا ہے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو وزیر کہا جائے اور اگر نہیں تو وہ محض معتمد (کاتب) رہ جاتا ہے۔

بقول ماوردی ایسے وزیر میں بھی سات صفات ہونی چاہئیں: قابل اعتماد ہو، راست باز ہو، لالچ سے پاک ہو، دشمنی سے محترز ہو، مرد ہو، ذہین ہو، سمجھ داری کے ساتھ اور عشق باز نہ ہو۔ اس کے لئے نہ یہ ضروری ہے آزاد ہو اور نہ یہ کہ عالم ہو۔ ایسا وزیر ذمی بھی ہو سکتا ہے، مگر وہ وزیر تفویض نہیں ہو سکتا۔

چار امور جن کی وزیر تفویض کو اجازت ہے ان کی وزیر تنفیذ کو اجازت نہیں ہے۔ وزیر تفویض مقدمات فیصل کر سکتا ہے، جنگ کی تیاری کر سکتا ہے اور اس کی نگرانی کر سکتا ہے کہ وہ کس طرح لڑی جا رہی ہے، لوگوں سے وہ مالیہ وصول کر سکتا ہے جو واجبی ہے اور جو ان کا واجب ہے وہ ان کو واپس کر سکتا ہے۔ وزیر تنفیذ کے لئے ان میں سے کسی بات کی

اجازت نہیں ہے۔ اس لئے اس کا نہ آزاد ہونا ضروری ہے، نہ قانون شریعت کا عالم، نہ فن حرب کا ماہر اور نہ تفصیلات سے واقف۔ لیکن یہی چار چیزیں وزیر تفویض میں ہونی ضروری ہیں۔

سربراہ دولت و حکومت خلیفہ ہوتا تھا اور اس کے ماتحت چند مرکزی دیوانوں کی تنظیم کی گئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک پر ایک افسر ہوتا تھا جو صرف خلیفہ کو جوابدہ تھا۔

ماوردی کا قول یہ ہے کہ اگر خلیفہ ان سے ان کے محکموں کے متعلق مشورہ کرتا ہو تو یہ وزیر کہے جانے کے مستحق تھے۔ یہ بالکل طبعی بات ہے کہ مرکز کے ان افسروں اور خلیفہ کے درمیان کچھ مشورہ ہوتا ہے۔ بہرکیف مہدی کے زمانے زمانے سے وزارت کی صورت اس وزارت سے مشابہ ہو گئی تھی جیسی عہد حاضر کے پارلیمنٹری طرز حکومت میں ہوتی ہے کہ ایک وزیراعظم ہوتا ہے اور کئی ماتحت وزیر ہوتے ہیں۔ مگر اس وقت کوئی پارلیمنٹ نہیں تھی اور کوئی مشترکہ ذمہ داری بھی نہیں کیونکہ دیوانوں کے افسروں کا تقرر عموماً خلیفہ کے ہاتھ میں تھا۔ اگر اس میں کوئی استثنٰی ہے تو جعفر اور فضل بن سہیل کی وزارتیں ہیں اور اس زمانے کی وزارتیں جب عباسی خلیفہ بے اختیار ہو گئے تھے۔

حاجب

حاجب خلیفہ اور عوام کے درمیان ایک واسطہ تھا چونکہ عوام کی تمام ضرورتیں وہ خود پوری نہیں کر سکتا تھا اس لئے یہ بات بالکل طبعی تھی کہ خلیفہ کی طرف سے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کوئی افسر مقرر کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عہدہ حضرت امیر معاویہؓ ہی کے زمانے سے ایجاد ہوا۔ جب مسجد میں امیر پر قاتلانہ

حملہ ہوا تو انہوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ کمرہ (حجرہ) تعمیر کرایا۔ انہیں نے سب سے پہلے اپنے دروازے پر پہرے دار مقرر کئے اور ہمیشہ اپنے ساتھ خاص باڈی گارڈ رکھتے تھے۔ مگر عبدالملک نے اس کام کے لئے حاجب مقرر کیا کہ جو لوگ خلیفہ سے ملنا چاہیں ان سے گفتگو کرے اور صرف انہی کو خلیفہ کے پاس بھیجے جن کو واقعی خلیفہ سے ملنے کی ضرورت ہو۔ خود حاجب ہی لوگوں کی بہت سی ضرورتیں پوری اور شکائتیں رفع کر دیتا تھا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں حاجب کی اہمیت بہت بڑھ گئی چونکہ خلیفہ تک اب لوگوں کی رسائی ایسی آسان نہیں رہی تھی جیسی اموی خلافت میں اس لئے حاجب کے اختیارات بہت بڑھ گئے۔ اس کو اس کا مجاز کیا گیا کہ لوگوں کی بہت سی شکائتیں وہی رفع کر دے تاکہ خلیفہ سے ملنے کی ان کو ضرورت نہ رہے۔

رفتہ رفتہ ان اختیارات میں اور اضافہ ہوا اور وہ ہمہ وقت خلیفہ کے ساتھ رہنے لگا۔ اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہو گیا کہ وہ غیر ممالک کے مستند سفراء اور معززین کو خلیفہ کی خدمت میں پیش کرے۔

دیوانہائے مرکزی

ہم ان پانچ دیوانوں کا پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں اور ان کے فرائض و عمل کا بھی جو عہد خلافت بنی امیہ میں موجود تھے۔ وہ حسب ذیل تھے :-

۱۔ دیوان جُند

۲۔ دیوان خِراج

۳۔ دیوان رسائل

۴- دیوان خاتم

۵- دیوان برید

ابتدائی خلفائے عباسیہ کے زمانے میں بھی یہی رہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس خلافت کی پہلی صدی کے آخر میں مندرجہ ذیل دیوانوں کا اور اضافہ ہوا:

۶- دیوان ازمہ (یعنی دیوان محاسبی و تنقید)

۷- دیوان ناظر المظالم (دیوان تفتیش شکایات)

۸- دیوان نفقات (دیوان اخراجات)

۹- دیوان سوافی (دیوان اراضیات شاہی)

۱۰- دیوان ذیہ (دیوان املاک و زمینداری)

۱۱- دیوان سر (وہ دیوان جو راز کے معاملات کے انصرام پر مامور تھا)

۱۲- دیوان اَرد (دیوان معائنہ عساکر)

۱۳- دیوان تقوی (دیوان معروضات)

۱- دیوان الجندوہی دیوان تھا جو حضرت عمرؓ نے قائم کیا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ سپاہ بھرتی کرے اور اس کو تنخواہ دے۔ چونکہ یہ کام نہایت اہم تھا اس لئے اس کی نگرانی راست خلیفہ یا وزیر کرتے تھے۔ بلا امتیاز قومیت تمام سپاہیوں کو تنخواہیں اور بھتے دیئے جاتے تھے۔ مگر اموی خلیفہ ہشام نے جو یہ اصلاح کی تھی کہ جو شخص کسی جنگ میں شریک نہ ہو اس کو کوئی وظیفہ نہ دیا جائے، وہ جاری رہی۔

حالت جنگ میں سپاہیوں کے دو طبقے ہوتے تھے ایک باقاعدہ سپاہی

جن کو حکومت سے تنخواہ ملتی تھی اور دوسرے مجاہدین جو مذہبی فریضہ سمجھ کر جنگ میں شریک ہوتے تھے۔ مجاہدین جب میدان جنگ میں ہوتے تھے تو ان کو صرف کھانا ملتا تھا اور مال غنیمت میں باقاعدہ سپاہیوں کی برابر حصہ۔ البتہ اس دوران میں ان کی بیویوں اور بچوں کو جنس یا نقد کی صورت میں وظیفہ ملتا رہتا تھا۔

ایک خاص جمعیت قائم کی گئی تھی جس میں سب غیر ممالک کے باشندے ہوتے تھے۔ یہ شاہی گارڈ تھا۔ ان کی تنخواہیں زیادہ ہوتی تھیں اور بڑی شاندار وردیاں۔ اس شاہی گارڈ کے علاوہ ایک اور جمعیت تھی جس کو خانگی سپاہ کہتے تھے۔

جن عہدے داروں کو آج کل ایڈی کانگ کہتے ہیں خلفائے بنی عباس کے ہاں ان کا نام غلمان الحجریہ تھا۔ یہ خلیفہ کے پیش خدمت ہوتے تھے، مگر جب وہ بڑے ہو جاتے تھے تو ایڈی کانگ کا کام کرتے تھے۔ ان کی تعلیم دربار میں ہوتی تھی اور یہ اچھی طرح عسکری تربیت کے بعد فوجی ملازمت میں داخل ہو جاتے تھے۔ ان کی بارکیں الگ ہوتی تھیں اور ان میں یہ فوجی ضوابط کے تحت رہتے تھے۔

ایک کور میں دس ہزار سپاہی ہوتے تھے اور ان کی کمان امیر یا جنرل کرتا تھا۔ ایک ہزار کی جمعیت یا بٹالین پر ایک قائد ہوتا تھا، اور سو سپاہیوں کی جمعیت یا کمپنی کے سردار کو نقیب کہتے تھے۔ دس آدمیوں پر عریف ہوتا تھا۔ سپاہ کی وردیاں ان کی جمعیتوں (کوروں) اور ان کے اسلحہ کی مناسبت سے ہوتی تھیں۔

سواروں کے پاس برچھے، حربے، تلواریں اور ڈھالیں ہوتی تھیں، تیر

اندازوں کے پاس کمانوں اور تیروں کے علاوہ تلواریں اور ڈھالیں بھی ہوتی تھیں۔

پیدل سپاہیوں کے سروں پر خود ہوتے تھے اور سینے بازوؤں اور ٹانگوں کی حفاظت کے لیے مختلف قسم کی زرہیں، جیسے چار آیئنہ اور جوشن وغیرہ ہر ایک کور کے ساتھ نفت سے آگ لگانے والوں کی ایک جمعیت ہوتی تھی اور ایک جمعیت ان کی کی جن کے پاس تلوار اور ڈھال کے ساتھ بیلچے وغیرہ ہوتے تھے تاکہ زمین کھودنے اور پل وغیرہ بنانے کا کام انجام دیں۔ یہ جو نفت پھینکنے والے تھے ان کے جسم پر ایسا لباس ہوتا تھا کہ اس پر آگ اثر نہیں کرتی تھی۔ وہ بلا تکلف دشمن کے جلتے ہوئے مورچوں میں گھس جاتے تھے۔

اموبوں کے زمانے میں پیدل سپاہی کی تنخواہ اوسطاً ایک ہزار درہم سالانہ تھی جو اس وقت کے چالیس پونڈ یا ۵۴۰ روپے ہوئے۔ پہلے عباسی خلیفہ سفاح نے گھٹا کر پیدل سپاہی کی تنخواہ ۸۰ درہم ماہانہ کر دی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سپاہیوں کی تنخواہ مختلف صوبوں میں وہاں کے مقامی حالات کی مناسبت سے مختلف تھی۔

بعد میں فوجیوں کی تنخواہیں کم ہونے کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک سونے کا نرخ اور دوسرے ممالک محروسہ خلافت کی وسعت جس میں فوجی بھرتی ہوتی تھیں۔ اسلام کے اس جمہوری اصول سے کہ جو کوئی اسلام قبول کر لیتا تھا اس کو عربوں کی برابر حقوق مل جاتے تھے اور عرب خاندانوں کے موالی بننے کے طریقہ نے وسیع پیمانے پر فوج کی بھرتی میں بڑی مدد کی، اسی وجہ سے آخری دور کے خلفاء اس کے پابند نہیں رہے تھے کہ صرف قبائل سے فوج بھرتی کریں۔ ان کی بہتر شرائط ملازمت دیکھ کر فرانسیسی، یونانی، افریقی، فارسی اور

بربر وغیرہ ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ بے شک اس سے افواج کی بھرتی کے لئے میدان تو بہت وسیع ہو گیا لیکن فوج میں وہ پہلی سی یکجہتی اور یک دلی نہیں رہی۔

فوجی تنظیم

زمانہ قدیم سے فوج پانچ حصوں میں تقسیم ہوتی تھی خواہ وہ کوچ میں ہو یا میدان جنگ میں: (۱) قلب جس میں سالار فوج ہوتا تھا۔ (۲) داہنا بازو (میسرہ)۔ (۳) بایاں بازو (میمنہ)۔ (۴) فوج کا مقدمہ جو جو آگے چلتا ہے (طلایہ) ہراول (۵) فوج کا پچھلا حصہ جو اس کی عقب سے حفاظت کرتا ہے ساقہ کہتے تھے۔

کوچ میں طلایہ کے سوار جو اپنے سازوسامان کے اعتبار سے ہلکے پھلکے ہوتے تھے اس شان کے ساتھ فوج سے کئی میل آگے چلتے تھے کہ جسم پر زرہ اور سروں پر چمکدار فولادی خود اور ان پر سیاہ شتر مرغ کے پروں کی کلغیاں۔ وہ کام جو اس زمانے میں اسکاوٹ کرتے ہیں اس سے مسلمان خوب واقف تھے۔ اسکاوٹس صرف اتنا ہی کام نہیں کرتے تھے کہ وہ آگے بڑھ کر گردوپیش کے حالات اور دشمن کی حرکات وسکنات کا اندازہ کریں بلکہ ان ملکوں کے نقشے بھی بناتے تھے جو راستے میں پڑتے تھے۔ ہر جنرل اپنے اسکاوٹس کے ذریعے سے خود نقشے مرتب کرتا تھا یا مستقر سے نقشے حاصل کرتا تھا۔

جب یہ عرب فوج دشمن کے ملک میں اس طرح چلتی ہوگی کہ ایک دستے کے پیچھے دوسرا دستہ اور پھر ان دستوں کا لامتناہی سلسلہ، تو وہ منظر بڑا پرشوکت اور دشمن کے لئے پرہیبت ہوتا ہوگا۔ آگے سواروں کے وہ دستے

ہوتے تھے جو خود و زرہ بکتر اور اسلحہ سے اس طرح آراستہ کہ ان کو فوجی اصطلاح میں بھاری کہا جاتا تھا، ان کے دہنے اور بائیں تیر اندازوں کی انجنیں جو پیدل اتنا ہی تیز دوڑتے تھے جتنا سواروں کے گھوڑے، ان کے پیچھے پیدل فوج جو بڑی شان سے ترتیب کے ساتھ چلتی تھی - ان کے بیچ میں اونٹوں کی طویل قطاریں جن پر اجناس، خوراک، اسلحہ اور خیمے ہوتے تھے - سب کے پیچھے اونٹوں اور خچروں اور گھوڑوں پر بیماروں اور زخمیوں کے لئے ڈولیاں، منجنیق اور دوسرے آلات جنگ -

محافظ دستے (باڈی گارڈ) کی چمکدار وردیاں، شاہانہ وضع کے علم جن پر سنہری کام، سالار اور افسر اپنی پرشوکت وردیوں میں نمایاں اور ممتاز - یہ پورا منظر حشمت و جلال کی تصویر ہوتا تھا - طلایہ اپنی منزل معینہ پر پہنچتے ہی خندقیں کھدواتی تھی اور جب فوج پہنچتی تھی تو ترتیب کے ساتھ خیمے نصب کئے جاتے، ان میں سڑکیں، چوک اور بازار قائم ہوتے اور لشکر گاہ ایک معمولی سا شہر بن جاتا تھا کوئی گڑبڑ اور کوئی بے ترتیبی نہیں ہوتی تھی، راشن تقسیم ہوتا اور فوراً آگ جلائی جاتی، کھانا تیار ہوتا - شام کا کھانا کھا کر جو بڑا اسا ہوتا تھا پوری فوج خلیفہ کے پیچھے عشاء کی نماز ادا کرتی اور اگر وہ نہ ہوتا تو قاضی لشکر کی امامت میں اور پھر سب لوگ حلقے بنا کر بیٹھ جاتے اور ان میں سابقہ جنگوں کے وہ واقعات بیان کئے جاتے، جن سے سپاہیوں کے دلوں میں جوش اور امنگ پیدا ہوتی -

عربوں کا قدیم طریقہ جنگ یہ تھا کہ سپاہی اکہری یا دوہری صفوں میں مل کر کھڑے ہوتے تھے، خواہ انہیں حملہ کرنا ہوتا یا مدافعت کرنی - لیکن مروان ثانی کے زمانے تک یہ طریقہ جنگ بالکل تبدیل ہو گیا - اب وہ حملہ

بھی ٹھوس اور مجتمع جیتھوں سے کرنے لگے اور اسی طرح حملہ روکتے بھی لگے ۔
حملہ روکنے کے لئے پیدل فوج مربعوں کی صورت میں اپنی تنظیم کرتی، وہ ایک
گھٹنا زمین میں ٹیک کر جھک جاتے اور اپنے لمبے برچھوں کی انیاں دشمن کی طرف
کر دیتے اور اپنی ڈھالیں اس طرح زمین پر کھڑی رکھتے کہ ان سے ان کا جسم
چھپ جاتا۔ اور اس کے منتظر رہتے کہ کب دشمن حملہ کرے اور وہ برچھوں
سے اس کا استقبال کریں۔ پیدل فوج کے پیچھے تیرانداز اور ان کے پیچھے
اور داہنے بائیں سواروں کے دستے ہوتے۔

دشمن کے قریب آتے ہی تیرانداز تیروں کی بارش کرتے، پیدل اپنی اپنی
جگہ قائم برچھوں سے دشمنوں کو روکتے اور سوار اس خالی جگہ سے جو درمیان
میں ان کے لئے چھوڑی جاتی، نکل پڑتے اور بڑھتے ہوئے غنیم پر حملہ آور ہوتے
جیسے ہی یہ معلوم ہوتا کہ دشمن کی فوج پیچھے ہٹ رہی ہے، فوج کے محفوظ
دستے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کرتے۔ تعاقب عموماً سوار فوج کرتی تھی جن میں
سوار تیرانداز بھی ہوتے تھے۔ حملے اور ہجوم کی صورت میں یہی ترتیب اور
یہی طرز جنگ برتا جاتا تھا۔

پہاڑ کی جنگ میں عرب بڑے ماہر تھے۔ محاصرے میں وہ منجنیق اور
دبابوں سے قلعوں کی دیواریں توڑتے تھے۔ منجنیق ایسے طاقتور تھے کہ وہ
پہاڑیوں کے پورے پورے ٹکڑے رکھ کر ایسے زور سے پھینکتے تھے کہ وہ بخط
مستقیم اُڑ کر دیواروں میں گھس جاتے تھے۔

انجینیر

انجینیروں کا ایک چنا ہوا عملہ ہر اس فوج کے ساتھ رہتا تھا جو

نقل و حرکت میں ہوتی تھی اور ہر شہر اور قلعے میں بھی اس فن کے افسر رہتے تھے۔ اس جمعیت کے افسر کو امیر المنجنیقین کہتے تھے۔ یہ عموماً معمولی باضابطہ فوج کی ملازمت سے اپنے کام کا آغاز کرتے تھے اور بعد کو انجینروں کی جمعیت میں ان کا تقرر ہو جاتا تھا یا ان مقامات میں قیام کرتے تھے جہاں ان کی تعیناتی ہوتی تھی۔ ان انجینیروں میں اپنے فن کا سب سے بڑا ماہر یعقوب بن صابر منجنیقی تھا، اس نے انجینیری پر ایک کتاب لکھی جس کا نام المحنت السابیک تھا۔ اس کتاب کے متعلق ابن خلکان یہ لکھتا ہے:۔ "اس نے جنگ کے متعلق ہر چیز پر بحث کی ہے، مثلاً: ترتیب جنگ، قلعوں کی تسخیر، مورچوں کی تعمیر، محاصرہ، سواری کی مشقیں، جنگی گھوڑے، ہر قسم کے اسلحہ کا استعمال، فوجی انجن (منجنیق وغیرہ) بنانا، دست بدست جنگ، سوار جمعیتوں کی مختلف اقسام اور گھوڑوں کے اوصاف۔"

جب فوج میدان کارزار میں ہوتی تھی تو اس کے ساتھ اطبا اور جراحوں کا عملہ بھی ہوتا تھا اور ایک پورا شفاخانہ جس میں ضرورت کا ہر سامان مہیا رہتا تھا۔ زخمیوں کے نقل و حمل کے لئے کئی قسم کی گاڑیاں ہوتی تھیں جنہیں اونٹ چلاتے تھے۔

ہر اہم مقام پر اسلحہ سازی کے کارخانے تھے۔ تجربہ کار اور ذی مرتبہ افسران کا معائنہ کرتے تھے۔

اس مقصد کے لئے ایک جداگانہ دیوان قائم تھا جس کا نام دیوان ارد تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ فوجی ساز و سامان کی نگرانی کرے۔ تمام اسلحہ خانے ایک خاص افسر کے ماتحت تھے۔ اس عہدے کا نام مشرف صنحت بالمخزان تھا۔

عربوں کو اپنی ہمسایہ قوموں پر صرف فوجی تنظیم ہی میں نہیں بلکہ سرعت نقل و حرکت میں بھی فوقیت حاصل تھی - یونانی اپنا سامان اور خورد و نوش کی اجناس گاڑیوں اور چھکڑوں میں لے جاتے، جن میں خچر، گدھے اور گھوڑے جتے ہوتے تھے - عرب یہ سب کام اونٹ سے لیتے تھے۔ اس لئے فوجیں سامان رسد اور سپاہیوں کے بستر وغیرہ اور اسلحہ ایسی تیزی سے پہنچائے جاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی - جب زیادہ طویل فاصلہ طے کرنا ہوتا تھا تو پیدل فوج کے لئے بھی گھوڑے یا اونٹ مہیا کئے جاتے تھے - اکثر ایسے چھوٹے کوچوں میں کہ جلدی پہنچنا ہوتا تھا ہر سوار ایک ایک پیدل سپاہی کو اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا لیتا تھا

عربوں کے دشمن یونشنم نے جس کا لقب عاقل تھا اور جو معتمد، معتضد مکتفی اور مقتدر کا ہم عصر تھا عربوں کے اس عہد کی تدبیر جنگ کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے، "جب عربی سلطنت کی عظمت اور طاقت ختم ہو چکی تھی"۔ ان کی جنگ کی ترتیب بلا تغیر ایک طویل مرلح کی صورت میں ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس پر حملہ دشوار ہوتا تھا اور ان کے لئے مدافعت کی سہولتیں اس میں بہت تھیں - یہ ترتیب کوچ میں اور جنگ میں بڑی سختی سے قائم رکھی جاتی تھی -

عرب اپنی جگہ استحکام کے ساتھ قائم رہتے تھے، وہ اپنے مقام سے ہلتے تک نہ تھے - اس میں مدنظر یہ تھا کہ وہ نہ جلدی سے حملہ کریں اور نہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد وہ جلدی جنگ بند کر سکیں - وہ عموماً اس کو ترجیح دیتے تھے کہ دشمن کے حملے کا انتظار کریں لیکن پہلے حملے کو دفع کرتے ہی وہ پوری طاقت سے آگے بڑھتے تھے - زمین پر اور سمندر میں دونوں

جگہ ان کا یہی ایک طریقہ تھا - پہلے وہ غنیم پر تیروں اور برچھیوں سے وار کرتے تھے پھر اپنی اپنی ڈھالوں کے کنارے باہم سختی سے ملا کر پیوستہ صفوں میں دشمن پر حملہ شروع کرتے تھے -

بہتر ترتیب میں اور احتیاط میں عرب دوسری قوموں سے ممتاز تھے وہ جنگ کے لئے جبری بھرتی کی مجبوری سے نہیں بلکہ بطیب خاطر جاتے تھے - امیر اپنے ملک کے لئے جنگ کرتے تھے اور اس کے لئے جانیں دیتے تھے اور غریب مال غنیمت کے لئے - ان کے ہم وطن ان کو اسلحہ دیتے تھے اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی غریب اور ضرورت مند مجاہدوں کے واسطے سامان حرب مہیا کرنے کے لئے چندہ دیتی تھیں -

خان کریمر جس نے تاریخ "ثقافت اسلامی تحت خلفاء" لکھی ہے اس پر یوں اظہار خیال کرتا ہے "بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ (قسطنطنیہ) جو عربوں کو وحشی اور کافر کہتا تھا، یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ گرے ہوئے بازنطینوں سے بہت زیادہ شائستہ تھے اور یہ کہ اس زمانے میں وہی ترقی اور تہذیب کی نمائندگی کر رہے تھے"

اور پھر وہ آگے لکھتا ہے :-

"بہت سی چیزوں سے ثابت ہے کہ جو دوسروں کو وحشی کہتے تھے فی الحقیقت خود ایسے تھے کہ ان کو وحشی کہا جائے - ہم کو لیو سے معلوم ہوتا ہے کہ "بازنطینی عربوں پر اور خصوصاً عرب سواروں پر زہر کے بجھے ہوئے تیر پھینکتے تھے، اور چونکہ عرب اپنے گھوڑوں کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اس لئے وہ اپنے گھوڑوں کو زہریلے تیروں سے بچانے کے لئے پیچھے ہٹنا گوارا کر لیتے تھے - دشمن کے دیہات لوٹنا اور ان میں آگ لگا دینا بازنطینیوں کے ضوابط میں داخل تھا، اس کے مقابلے میں عرب اس کی بہت کم اجازت دیتے تھے"

لوٹ اور غنیمت کے متعلق بازنطینوں کے ہاں کوئی ضوابط نہیں تھے لیکن مسلمانوں کے قانون شریعت میں اس کے لیے سخت اصول تھے اور اس وقت تک ان کی سختی سے پابندی کی گئی جب تک کہ پرانے قوانین میں خلل نہ آیا۔ عربوں کی اخلاقی برتری آس مذکورہ بالا فقرے سے ظاہر ہے کہ وہ جنگ میں اپنی خوشی سے شریک ہوتے تھے۔

عربوں کی عسکری طاقت میں ضعف واثق خلیفہ مقتدر کے عہد حکومت سے آیا، اور یہ بالخصوص سپاہیوں کو تنخواہیں دینے کے طریقے میں تبدیلی کی وجہ سے اب یہ ہوگیا تھا کہ سپاہیوں کو تنخواہیں مرکزی بیت المال کی جگہ گورنر (والی) اور علاقوں کے سپہ سالار دینے لگے تھے جن کو اس غرض کے لئے بعض صوبے دیدیئے گئے تھے۔ فضول خرچ اور عیش پرست دربار کے لیے یہ ناممکن ہوگیا تھا کہ معمولی آمدنی سے حکومت کا خرچ چلائے۔ اس لیے مقتدر نے اپنے امرا کو اس شرط پر صوبے دے دیئے کہ وہ تمام آمدنی اپنے طور پر وصول کریں، اس سے حکومت کا خرچ چلائیں اور فوج کی تنخواہیں دیں اور ایک معینہ رقم دربار بغداد میں داخل کریں۔ ان جاگیروں کو اکتبات کہتے تھے۔

بودیہ نے یہ کیا کہ سپاہیوں کو تنخواہ میں زمینیں دینے لگے۔ یہ فوجی جاگیریں ہر قسم کے محصول سے بری ہوتی تھیں اور ان سے جو پیداوار ہوتی تھی وہ جاگیرداروں یعنی سپاہیوں اور افسروں کی ہوتی تھی۔ "اس کا نتیجہ یہ ہوا تہذیب و تمدن میں تنزل آیا اور نہایت زرخیز اور دولت مند صوبے مفلس اور غیر آباد ہوگئے۔ غیر ملکیوں نے بتدریج عرب قوم کے لوگوں کو زمین سے بے دخل کردیا۔" جنگہائے صلیبی کے آغاز سے ذرا ہی قبل مغربی ایشیا کی سیاسی اور معاشرتی حالت کسی اعتبار سے یورپ کی سی تھی۔ وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا جو

خلیفہ کو اسی طرح اپنا مذہبی پیشوا سمجھتی تھیں جس طرح مغرب میں پوپ کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ مفاد میں کوئی اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے یہ اکثر باہم لڑتی تھیں، انہوں نے اپنی خود غرضانہ رقابتوں اور حصول عظمت کی تمنا میں سلطنت کو کمزور کر دیا۔

بحریہ

شام اور مصر کی فتح سے سمندر کا طویل و عریض حصہ عربوں کے قبضے میں آگیا تھا اور تجارتی بندرگاہوں کی حفاظت اور دشمن کے مقابلے کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہوگئی تھی کہ بحری بیڑہ قائم کریں اور اسے برقرار رکھیں۔ اس لیے بحری بیڑے میں آدمی رکھنے اور اس کے ساز و سامان کی درستی کی طرف بڑی توجہ کی گئی۔ مصر اور شام کی تمام بندرگاہوں میں اور خلیج فارس کے بندرگاہ اُبلّا اور بوشہر میں ڈاک یارڈ تھے جن میں جہاز بنتے تھے۔ عربوں کے جہاز بازنطینی جہازوں سے بڑے ہوتے تھے لیکن غالباً رفتار میں ان کی طرح تیز نہیں۔

تجارتی بیڑہ بھی ایسا ہی اچھا تھا اور بحری تجارت کی نگہداشت اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ جنگی بیڑے میں صرف وہی جہاز نہیں تھے جو گورنمنٹ بحری جنگ کے لیے تعمیر کراتی تھی بلکہ تحت حکم سرکار ہر صوبہ اور ہر بندرگاہ کسی معینہ تعداد میں جہاز تعمیر کرا کر دینے پر مجبور تھا۔ ہر جنگی جہاز کی کمان قائد یا مقدم (کپتان) کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور جہاز میں جتنے بحری سپاہی ہوتے وہ اسی کے تحت حکم ہوتے تھے اور وہی ان کی قواعد، مشقوں اور ساز و سامان کا نگراں ہوتا تھا۔ نیز ایک دوسرا افسر رئیس کہلاتا تھا۔ یہ جہازرانی کے کام میں مصروف رہتا تھا۔ پورے بیڑے کے افسر اعلیٰ کو امیر المار یا امیر البحر کہتے تھے۔ اسی سے لفظ

ایڈمرل بنایا گیا ہے۔

۲۔ دیوان الخراج بھی حضرت عمرؓ ہی کے عہد خلافت میں قائم ہوا۔ اس دیوان کا کام یہ تھا کہ جو محصولات وصول ہوں اور جو خرچ ہو اس کا حساب رکھے۔ اصل میں یہ مرکزی مالی بورڈ تھا۔ صوبوں میں جو رقم ملازموں کی تنخواہ ادا کرنے اور دوسرے اخراجات کے بعد بچتی تھی وہ اسی دیوان میں جمع ہوتی تھی اسی طرح اگر کسی صوبے میں خسارہ ہوتا تو یہی دیوان وہ کمی پوری کرتا تھا۔

وسائل آمدنی

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے امویوں کے عہد میں بعض خلاف شریعت محصولات وصول کئے جاتے تھے۔ مالی انتظام کے لئے از روئے شریعت صحیح اور مستحکم اصول معین کرنے کی غرض سے ہارون الرشید نے امام ابو یوسف سے جو اپنے عہد کے عظیم فقیہ تھے، یہ فرمائش کی کہ وہ کوئی ایسی کتاب لکھیں جس سے مالی امور میں رہنمائی ہو سکے۔ اس پر امام ابو یوسف نے اپنی مشہور کتاب الخراج لکھی اس میں انہوں نے تمام اصولوں کی صاف وضاحت کی اور اس کی تاریخ بیان کی کہ کس طرح ان کا ارتقاء ہوا۔ نیز انہوں نے یہ بتایا کہ آئندہ کیا روش اختیار کی جائے اور خلیفہ کو ان بداعمالیوں سے آگاہ کیا جو مالی انتظام میں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کو یہ نصیحت کی کہ ان کا استیصال کرے۔

کتاب الخراج کی رو سے وسائل آمدنی حسب ذیل ہیں :۔

الخمس : امام ابو یوسف نے اس ذریعہ آمدنی کے تحت میں وہ تمام مدات بھی داخل کر لی ہیں جن پر خمس عائد ہوتا ہے جیسے معدنیات اور وہ قیمتی دھاتیں جو زمین سے کھودی یا چھینی جائیں، دفینے اور وہ قیمتی اشیاء جو سمندر

حاصل ہوں۔

امام ابو حنیفہ اور اکثر حنفی فقیہوں کی یہ رائے ہے کہ خمس اسی طرح خرچ ہونا چاہیئے جس طرح چار خلفاء کرتے تھے۔ لیکن امام ابو یوسف نے امام شافعی کی رائے اور حضرت عمر بن عبدالملک کے تعامل کی تائید کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ عامۃ المسلمین کی مشترکہ بھلائی کے لیے خرچ ہو اور آپ کے رشتہ داروں کا حصہ بنو ہاشم کو دیا جائے۔ امام ابو یوسف کی شرعی رائے کی بنا پر خلفائے بنو عباس غنیمت کا یہ حصہ اپنی ذات پر خرچ کرنے لگے۔

زکواۃ:۔ زکواۃ جو صرف مسلمانوں سے وصول کی جاتی تھی عہد عباسیہ میں اس کی شرح بھی وہی رہی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرما دی تھی اور اس کے خرچ کی جو مدات قرآن نے مقرر کر دی ہیں ان کی پابندی بھی اسی سختی سے کی گئی جس طرح پہلے ہوتی تھی۔ مگر امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ زکواۃ جس شہر سے وصول کی جائے اسی شہر میں وہ خرچ ہونی چاہیئے اس سے باہر روانہ جائے۔

عُشر:۔ امام ابو یوسف نے مندرجہ ذیل اقسام اراضی کو عُشری قرار دیا ہے:۔

۱۔ بنو تغلب کے علاوہ تمام عربی زمینیں۔

۲۔ وہ تمام غیر عربی زمینیں جن کے مالک مسلمان ہو گئے ہوں۔

۳۔ وہ تمام غیر عربی زمینیں جو مسلمانوں نے لڑ کر فتح کی ہوں اور خلیفہ نے فاتحین میں تقسیم کر دی ہوں۔

امام ابو یوسف خلیفہ کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ مفتوحہ عربی زمینیں سپاہیوں کو عطا کرے اور فئے کی زمینیں امتیازی خدمات کے صلے میں مسلمانوں

کو بطور زمینداری دے۔ یہ زمینیں خراجی زمینوں کے طور پر بھی دی جاسکتی ہیں اور عشری کے طور پر بھی۔

مذکورہ بالا اقسام زمین کے علاوہ ایسی افتادہ زمینیں، دلدلیں اور جنگل بھی جنہیں مسلمان بغیر خراجی وسائل آبپاشی استعمال کئے قابل کاشت بنائیں، عشری ہو سکتی ہیں۔ مگر پھر بھی حضرت عمرؓ نے جو قاعدہ مقرر کر دیا تھا کہ خراجی زمینیں عشری زمینوں میں تبدیل نہیں کی جاسکتیں اکثر حالات میں قائم رہا۔ نصر بن سیار نے اموی عہد حکومت میں جو اصلاحات نافذ کی تھیں وہ تمام مقاصد و اغراض کے لئے عباسیوں کے عہد میں بھی اختیار کی گئیں۔ اس اصلاح کی رو سے ہر موضع پر محصول معین کیا جاتا تھا اور تمام مسلم اور غیر مسلم زمیندار اپنی زمین کے رقبے کے تناسب سے اس کی ادائیگی میں شریک ہوتے تھے۔ اس اصلاح کا فائدہ یہ تھا کہ ایک طرف حکومت کو مالگزاری میں نقصان نہیں ہوتا تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کو اس کی اجازت تھی کہ خراجی زمینیں اپنی ملکیت میں رکھیں۔

جزیہ :- جزیہ ان تمام غیر مسلموں سے لیا جاتا رہا جو اس قابل تھے کہ ملک کی حفاظت میں ہتھیار چلائیں۔ اس محصول کا تعین اس طور سے کیا گیا کہ امیروں پر فی کس ۴۸ درہم سالانہ، اوسط درجے کے لوگوں پر ۲۴ درہم، غریبوں پر ۱۲ درہم۔

بنو تغلب کے عیسائی، جن کو جزیے سے مستثنیٰ کیا گیا تھا، اسی انتظام کے مطابق جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا تھا دگنی زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ اسلامی تاریخ لکھنے والے غیر مسلموں کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ جزیہ ان لوگوں کے لئے ذلت کی علامت تھی جن پر وہ عائد کیا جاتا تھا، یا

مسلم اور غیر مسلم کے درمیان برتاؤ میں فرق کی، بلکہ یہ بہت بڑی رعایت تھی جو مسلمان فرمانرواؤں نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کی۔ اس محصول کے عوض صرف یہی نہیں کہ تمام غیر مسلم عسکری خدمت سے مستثنیٰ کر دیئے گئے بلکہ ان کے جان و مال اور مذہبی عقیدے کی حفاظت کی ضمانت بھی کی گئی۔ وہ سب لوگ جو ہتھیار چلانے کے قابل نہ تھے جیسے عورتیں، بچے، اندھے، اپاہج اور بوڑھے جزئے سے مستثنیٰ تھے حتیٰ کہ مفلسوں، غریبوں اور بیروزگاروں سے بھی جزیہ طلب ہی نہیں کیا جاتا تھا۔

خراج:۔ امام ابو یوسف خلیفہ کو اس میں مختار قرار دیتے ہیں کہ خواہ وہ مفتوحہ زمینیں فاتحین میں تقسیم کر دے یا اسی ملک کے باشندوں کے قبضے میں رہنے دے۔ جب یہ زمینیں ان کے اصل مالکوں کے قبضے میں چھوڑی جاتی تھیں تو وہ ان کی ناقابل انتقال ذاتی ملک ہو جاتی تھیں۔ اس طرح وہ سب زمینیں جو غیر مسلموں سے لڑکر فتح کی جاتی تھیں اور نیز وہ جو قبضے میں آتی تھیں خراجی زمینیں ہوتی تھیں۔

حضرت عمرؓ نے محصول کا نرخ معین کر دیا تھا لیکن امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ خلیفہ کی ہدایت پر نرخ تبدیل ہو سکتا ہے۔ اسی کے مطابق مامون نے سواد کی زمینوں کے ٹیکس کا نرخ پیداوار کے نصف کی جگہ $\frac{2}{5}$ کر دیا یہ بیس فی صدی کی کمی تھی۔

ماوردی نے خراج کی تشخیص کے تین طریقے بیان کئے ہیں:۔

۱۔ پورے موضع کی زمین پر بلا اس کا لحاظ کئے خراج عائد کیا جاتا تھا کہ واقعی کتنی زمین زیر کاشت ہے۔

۲۔ محض مجموعی رقبہ کاشت کی بنا پر خراج عائد کیا جاتا تھا۔

۳۔ گاؤں کی مجموعی پیداوار تقسیم کی جاتی تھی اور حکومت اس میں سے اپنا حصہ لیتی تھی۔ بالمقطع خراج کی تشخیص کو تکملہ کہتے تھے اور مقتدر کی حکومت میں یہ بند کر دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ تینوں طریقے جو ماوردی نے بیان کئے ابتدائی خلفائے عباسیہ کے عہد میں رائج تھے۔

ابتدائی عباسی خلفاء کے زمانے میں تحصیل محصولات کا کام ٹھیکے داروں پر چھوڑ دیا گیا تھا جس کے عوض ان کو ایک مقررہ رقم دی جاتی تھی۔ اس سے مختلف قسم کی بد انتظامیاں واقع ہوئیں۔ امام ابو یوسف نے اس طریقے کی سخت مذمت کی ہے۔ یہ طریقہ جس کو تقبیل کہتے تھے اس کا باعث ہوا کہ ٹھیکیدار رعایا سے جبراً ناجائز رقوم حاصل کرنے لگے۔ امام ابو یوسف اس طریقے کی صرف اس صورت میں اجازت دیتے ہیں کہ موضع کے لوگ خود اپنے میں سے کسی معتبر آدمی کو تجویز کریں کہ اس کو خراج وغیرہ کی رقم وصول کر کے ان کی طرف سے خزانے میں داخل کرنے کی اجازت دی جائے۔

۴۔ عشر بھی حضرت عمر رضؓ کے زمانے سے شروع ہوا اور اموی اور عباسی حکومتوں میں جاری رہا۔ امام ابو یوسف نے خراج اور خیرات (زکواۃ، صدقات اور عشر) میں صاف فرق کیا ہے۔ خیرات کے آٹھ خرچ قران میں صاف بیان کر دئے گئے ہیں۔ امام ابو یوسف یہ طے کرتے ہیں کہ مندرجہ ذیل پانچ اخراجات خزانے سے پورے ہونے چاہئیں:-

(۱) قاضیوں، والیوں اور دوسرے سرکاری عہدے داروں کی تنخواہیں۔

(۲) سپاہیوں کے وظائف۔

(۳) آب پاشی کے لئے نئی نہروں کی کھدائی اور پرانی نہروں کی مرمت۔
(۴) بڑے شہروں میں آب رسانی کے لئے نہروں کی کھدائی۔
(۵) جیل خانوں کا انتظام۔

دیوان رسائل :- دیوان رسائل اموی عہد خلافت میں پیدا ہوا۔ صدر دیوان کے فرائض، جس کو حکومت کا خاص سیکریٹری سمجھنا چاہیئے، یہ تھے کہ شاہی فرامین، اسناد، اعلان نامے لکھے اور عام طور پر سیاسی خط وکتابت کرے۔ اور جب خلیفہ یا وزیر انہیں منظور کریں تو ان کو مہر کر دے۔ بعض اوقات وہ سرکاری خطوط کی نظر ثانی اور اصلاح کر کے خود ہی اُن پر مہر لگا دیتا تھا۔ وہ خلیفہ کے ان عام درباروں میں بھی شریک ہوتا تھا جن میں خلیفہ لوگوں کی شکایتیں سنتا تھا اور مستغیثوں کی درخواستوں پر فیصلے دیتا تھا۔ اس صورت میں فیصلے کی ایک نقل مدعی کو دی جاتی تھی اور اصل سرکاری محافظ خانے میں رہتی تھی۔

دیوان خاتم :- یہ بھی اموی خلفاء کے عہد میں شروع ہوا۔ بعض یورپین مورخ یہ لکھتے ہیں کہ دیوان خاتم کی جگہ دیوان توقیع نے لے لی تھی۔ میورؔ لکھتا ہے کہ دیوان توقیع کی صدارت ہارونؔ الرشید کا وزیر جعفرؔ کرتا تھا جب جعفر دیوان نظارۃ المظالم کی صدارت کرتا اور مستغیثوں کی درخواستوں پر احکام صادر کرتا تو وہ توقیعات کہلاتے تھے۔

دیوان البرید :- یہ دیوان بھی خلافت امویہ میں قائم ہوا مگر اس کو زیادہ اہمیت عہد عباسیہ میں ہوئی۔ یہ صرف عوام ہی کے خطوط نہیں پہنچاتا تھا بلکہ اس تمام سرکاری مراسلت کی ترسیل اسی کے ذریعے سے عمل میں آتی تھی جو

لہ Muir.

باہم صوبوں کے اور صوبوں اور مرکز کے کارپردازان حکومت کے درمیان ہوتی تھی۔ صوبوں میں دیوان البرید کی خدمت پر جو افسر مامور تھے وہ اصل میں وہ خفیہ خبر رساں ہوتے تھے جن کا کام یہ تھا کہ سلطنت کے مختلف حصوں میں جو واقعات ہوں ان پر نظر رکھیں اور ایسے واقعات کی اطلاع بھیجیں جو حکومت کی توجہ کی قابل ہوں۔ ایسے تمام راستوں پر جو دارالخلافت کو آتے تھے منزلیں قائم کردی گئی تھیں اور ان میں پیغام رسانوں کی چوکیاں۔ ان چوکیوں پر ہلکارے تبدیل ہوتے تھے۔

خلیفہ مہدی نے ایک نئی سڑک بنوائی جس نے یمن سے مکے تک اور مکے سے بغداد تک ڈاک کی چوکیاں قائم کی تھیں۔ یہ ڈاک ہلکاروں کے ذریعے سے بھی جاتی تھی جو پیدل دوڑتے تھے اور اونٹوں اور گھوڑوں کے سواروں کے ذریعے سے بھی۔ بعض اوقات کبوتروں سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی برید کے ذریعے فوج کی چھوٹی سی جمعیت بھی بھیجدی جاتی تھی۔

بغداد میں بسرکردگی "صاحب البرید و الاخبار" ایک مرکزی دفتر بھی تھا جس کے پاس سلطنت کی تمام خبریں اور اطلاعیں آتی تھیں۔ محکمہ برید کے افسر اعلٰی کا یہ فریضہ تھا کہ اس کے ماتحتوں کے پاس سے جو مراسلے اور اطلاعات آئیں وہ یا ان سے رپورٹ مرتب کرکے خلیفہ کے سامنے پیش کرے۔ اور چونکہ اس کا اصل کام یہ تھا کہ وہ خفیہ خبر رسانی میں رہنمائی کرے اور اس کی نگرانی (جو اس وقت ڈائرکٹر آف انٹیلی جنس کے فرائض ہیں) اس لئے وہ اس پر مامور تھا کہ راستوں اور منزلوں کے متعلق اس کی معلومات اس سے زیادہ اور خصوصی ہو جو معمولی طور پر حاصل ہو سکے تاکہ اگر خلیفہ کو خود سفر کرنا ہو یا چھوٹے راستے سے جلد فوج بھیجنی ہو تو اس سے مدد ملے۔ برید کے افسروں نے راستوں کے

متعلق جو کتابیں مرتب کی تھیں وہ مسلمانوں کے ابتدائی جغرافیے تھے ۔ ان میں مختلف راستوں کے ساتھ ان شہروں کا مختصر ذکر ہوتا تھا اور نیز ان صوبوں کی آمدنی اور پیداوار بھی درج ہوتی تھی، جن سے یہ راستے گزرتے تھے۔ صاحب البرید کے دوسرے فرائض یہ تھے کہ مختلف شہروں میں برید کے مقامی عہدہ دار، موزوں سیکرٹری اور سڑک کی چوکیوں پر موزوں اہلکار اور ہلکارے مقرر اور نامزد کرے اور اس پر نظر رکھے کہ سب کو تنخواہیں مل گیئں اور رسد پہنچ گئی۔ صاحب البرید والاخبار صرف پوسٹ ماسٹر جنرل اور جاسوسی کا نگران اعلےٰ ہی نہیں تھا بلکہ خلیفہ کا راست خفیہ کارپرداز بھی ہوتا تھا۔ اس کو یہ اختیار تھا کہ تمام صوبوں میں برید کے عہدہ دار مقرر، اور ان کی عام نگرانی کرے اور ان کی تنخواہوں کی تقسیم کا وہ ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات بڑے وسیع تھے، والیوں (گورنروں) تک کے خلاف وہ لکھ سکتا تھا۔

(۶) دیوان الازمہ :۔ یہ دیوان خلیفہ مہدی نے قائم کیا تھا۔ مرکز میں اس کا یہی نام تھا مگر صوبوں میں اس کو الزمام کہتے تھے ۔ یہ آڈٹ اور اکاونٹس (تنقید و محاسبی) کے متعلق تھا اور آمدنی اور خرچ پر پورا قابو رکھنا اس کی ذمہ داری تھی ۔ سابق میں تمام دفاتر ایک حاکم یعنی وزیر کے ماتحت یکجا تھے۔ مہدی نے یہ طے کیا کہ تمام محکموں کے حسابات پر اختیار اور قابو رکھنے کے لئے ایک خاص دفتر ہونا چاہیئے، دیوان الزمہ جس میں ہر دیوان کا رجسٹر (زمام) ہو ایک عہدہ دار کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے اور ان سب پر اختیار برتنے کے لئے ایک نگران اعلےٰ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے بعد سے یہ ہوا کہ ہر اس سرکاری محکمے میں جس کا تعلق مالی لین دین سے تھا ایک الگ رجسٹر رہنے لگا جس کے ذریعے سے آمد و خرچ پر قابو رکھا جا سکے، اس طرح دیوان الخراج کا دیوان زمام

الخراج قائم ہوگیا جو مال گزاری اور مال گزاری کی تمام زمینوں کے معاملات کی نگرانی کرتا تھا۔

(۷) دیوان ناظر فی المظالم :۔ اس دیوان کا کام یہ تھا کہ عوام کی شکایات پر غور کرے اور جن مقدمات میں نا انصافی ہوئی ہو اسے رفع کرے۔ یہ راست خلیفہ یا اس کے نمائندوں کی نگرانی میں تھا۔ اکثر یہی ہوا کہ خلیفہ ہفتہ میں ایک دن اس فریضے کی انجام دہی کے لئے الگ رکھتا تھا۔ اس دن خلیفہ یا اس کا نمائندہ ہر شہری سے ملنے کے لئے موجود رہتا تھا اور بلا اس لحاظ کے کہ مدعا علیہ کس حیثیت اور مرتبے کا شخص ہے، نہایت ہی غیر جانبداری کے ساتھ مقدمات میں فیصلہ دیا جاتا تھا۔

ہارون رشید کے عہد میں اس کا وزیر جعفر اس دیوان کی صدارت کرتا تھا۔ ایک روز جعفر نے ایک ہزار مقدمات فیصل کئے اور ان میں مختصر فیصلے دئے۔ ان کا معائنہ کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی فقرہ جو اس نے ایک جگہ لکھ دیا وہ پھر نہیں دہرایا اور کوئی فیصلہ حق کے خلاف نہیں تھا۔ مامون نے ایسے مقدمات کرنے کے لئے اتوار کا روز مقرر کیا تھا۔

ایک عورت نے خلیفہ کے بیٹے کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ مامون نے ایک قاضی کو حکم دیا کہ اس کی موجودگی میں وہ مقدمہ فیصل کرے۔ قاضی نے خلیفہ کے بیٹے کے خلاف فیصلہ دیا اور وہ نافذ کیا گیا۔ قاضی کے فرائض و اعمال عدلیہ کے تحت پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

(۸) دیوان النفقات :۔ یہ دیوان دربار خلافت کی ضروریات کے متعلق تھا اور دربار کے عہدہ داروں کی تنخواہوں کی تقسیم، بہم رسانی اجناس شاہی عمارتوں کی مرمت اصطبل کی نگرانی کا کام انجام دیتا تھا۔

۹- دیوان سوافی اور دیوان دبہ :- چونکہ سوافی کے معنیٰ ہیں شاہی زمینیں اور دبہ کے معنیٰ زمینداری ریاستیں، اس لیے شاہی زمینیں دیوان سوافی کے انتظام میں دی گئیں اور خلیفہ کی ذاتی جائداد دیوان دبہ کے انتظام میں -

۱۰- دیوان بیر :- چونکہ یہ دیوان دیوان رسائل ہی کی ایک شاخ معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ دونوں دیوان ایک ہی افسر کی ماتحتی میں دئے گئے -

۱۱- دیوان الارد :- یہ دیوان فوجی ساز و سامان کی نگرانی سے متعلق تھا - تمام اسلحہ خانے ایک خاص افسر کے ماتحت تھے جس کے عہدے کا نام مشرف الصنحت بالحزان تھا - ہو سکتا ہے کہ یہ دیوان الجند کی ایک شاخ ہو -

۱۲- دیوان توقیع :- کسی استغاثے یا درخواست پر جو حکم دیا جاتا تھا اس کو توقیع کہتے تھے - اسی وجہ سے اس دیوان کا یہ نام ہے - ابتدا میں درخواستوں اور معروضات پر خلیفہ یا اس کا نمائندہ اختصار کے ساتھ اپنی رائے، فیصلہ یا حکم لکھ دیتا تھا - ایک رجسٹر میں اس کا اندراج ہوتا تھا اور ایک نقل اہل معاملہ کو بھیج دی جاتی تھی - یہ مختصر تحریر جامع، جمیل اور صاف ہوتی تھی - بعد کو ایک باضابطہ دیوان قائم ہو گیا جو اسی نام سے معروف ہوا - اس میں اس مختصر نوٹ یا توقیع کی بنا پر باضابطہ دستاویزات مرتب ہونے لگیں جو رجسٹر میں درج ہوتی تھیں اور اہل معاملہ کو بھیجی جاتی تھیں -

یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوان نے دیوان الخاتم کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا تھا -

صوبائی تنظیم

عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ اسلامی ملک میں دنیوی اختیار کا کوئی ایک مرکز باقی نہیں رہا - اسی وقت سے پراگندگی واقع ہوئی اور اس کے باوجود مسلسل بڑھی کہ ایک صدی سے زیادہ تمام اسلامی دنیا صرف دو حکومتوں میں تقسیم رہی - مشرق میں عباسیوں کی خلافت تھی اور مغرب میں یعنی ہسپانیہ میں امویوں کی امارت -

مشرقی خلافت کے تمام صوبوں میں اگرچہ اس اعتبار سے نظام حکومت یکساں تھا کہ ہر صوبے کا انتظام ایک امیر اور ایک عامل کے ماتحت تھا اور ان کا تقرر بغداد سے ہوتا تھا، مگر صوبوں کی حکومتیں تفصیل میں باہم دگر بہت مختلف تھیں اور یہ مختلف مقامی روایات اور اتفاقی حالات کی وجہ سے عراق چونکہ دار الخلافت سے متصل تھا اس لئے اس کا وہ زرخیز علاقہ جسے سواد کہتے تھے کسی گورنر کے ماتحت نہیں، بلکہ وزیر دولت کے انتظام میں تھا دیوان سواد کی وزارت بڑے نفع کی چیز سمجھی جاتی تھی اس لئے لوگ اس کے بڑے طالب تھے - اسی طرح ضلع بدوریہ میں خصوصی دلچسپی تھی کیونکہ وہ دریائے دجلہ کے داہنے کنارے پر واقع اور بغداد کے شمالی گوشے سے متصل تھا - جو اس کا اچھی طرح انتظام کرسکتا وہ اس قابل سمجھا جاتا تھا کہ محکمہ خراج کا وزیر بنے اور وزارت خراج وزارت عظمےٰ کے لئے قابلیت کی سند تھی - عراق کے بقیہ ضلع خاص کے انتظام کے لئے اس وقت تک عامل یا والی خلیفہ مقرر کرتا رہا جب تک حکومت کی تفصیلات سے اس نے تعلق رکھا پھر یہ کام اس وقت تک وزیر نے انجام دیا جب تک وہ صاحب اختیار رہا -

خلافت عباسیہ کے ابتدائی عہد میں دوسرے صوبوں کا انتظام اسطرح تھا کہ ہر صوبے میں خلیفہ کا نائب (عامل) صوبے کا حاکم ہوتا تھا۔ وہ اپنے صوبے کی حدود کے اندر خلیفہ کے نمائندے کی حیثیت سے وہ تمام فرائض انجام دیتا تھا جو مرکز میں خلیفہ۔

مگر پھر بھی عامل کے اختیارات اور دوائر عمل بہت محدود ہو گئے تھے منصور کی حکومت میں گورنر کو زیادہ عرصے نہیں رہنے دیا جاتا تھا۔ عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد اس کو اپنے انتظام حکومت کا پورا حساب دینا پڑتا تھا اور اگر یہ ذرا سا شبہ پیدا ہو جاتا کہ اس نے اعتماد شکنی کی ہے تو وہ اس کی پوری جائداد کی ضبطی کا باعث ہوتا تھا۔

منصور کی حکومت میں والی (گورنر) کا عہدہ کوئی آسان اور نفع کی چیز نہیں تھا۔ اس کے جانشینوں کے عہد میں اگرچہ ان کے اختیارات کم ہو گئے مگر ان کی حیثیت زیادہ قابل اطمینان تھی۔ وہ صوبوں میں صرف شعبہ انتظام اور فوج کے افسران اعلےٰ رہ گئے تھے، محض اپنے کام سے ان کو کام تھا اور جب خلیفہ چاہتا انہیں برخاست کر سکتا تھا۔ تقرر کے وقت ان کو پروانہ تقرری دیا جاتا تھا جس میں ان کی شرائط ملازمت، تنخواہ اور اختیارات درج ہوتے تھے۔

صوبے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے سے پہلے گورنر صوبے کی خاص مسجد میں آتا اور اپنے تقرر کے اعلان کے لئے لوگوں کو اپنا پروانہ تقرری پڑھ کر سناتا تھا۔ ان عہدہ داروں کی بہت بڑی تنخواہیں ہوتی تھیں، اور بقول ماوردی وہ مندرجہ ذیل فرائض انجام دیتے تھے۔

۱۔ صوبے کے عسکری امور پر قابو رکھنا اور سرحدوں کی حفاظت

کرنا۔

۲۔ شریعت کے مطابق محصولات عائد کرنا اور ان وسائل سے جو آمدنی ہو اس سے صوبے کے اخراجات پورے کرنا۔

۳۔ صوبے میں امن و انتظام قائم رکھنا۔

۴۔ بدعات سے مذہب کو بچانا۔ ملّت کے اخلاق کی نگرانی کرنا، پولیس کے انتظام پر قابو رکھنا اور جمعے کی نمازوں میں امامت کرنا۔

۵۔ ہر سال حج کے لیے قافلوں کے لیے تنظیم اور ان کا سامان درست کر کے انہیں روانہ کرنا۔

۶۔ کُفّار کے خلاف جہاد کرنا۔

۷۔ افواج کی تعیناتیاں کرنا، ان کی تنخواہیں دینا اور قاضیوں کے فیصلے نافذ کرنا۔

گورنر صوبوں میں مظالم کے مقدمات کی سماعت کر کے خلیفہ کا یہ فریضہ بھی انجام دیتا تھا۔ مظالم کے مقدمات یہ ہوتے تھے:۔ اہلکاروں کی طرف سے لوگوں پر زیادتیاں اور ان سے زیادہ محصولات وصول کرنا، اور رجسٹروں میں ناموں کا اندراج نہ ہونا، روپئے کا بے جا خرچ، یا کسی کی املاک پر دوسرے کا قبضہ، جائداد کی خلاف انصاف ضبطی، واجبی تنخواہوں کا ادا نہ کرنا، حقوق زوجیت کی ادائیگی روک لینا، قاضی کے فیصلے کی تعمیل نہ کرنا، جماعت کی نمازیں ادا نہ کرنا، برملا اور بالاعلان ناروا طرز عمل اختیار کرنا۔

وزیروں کے معاملے میں ماوردی گورنروں کی دو قسمیں لکھتا ہے:۔ ایک وہ جن کو پورے اختیارات حاصل ہوں اور دوسرے وہ جن کے اختیارات محدود ہوں۔ ان

دو کے ساتھ وہ ایک تیسری قسم کا اور اضافہ کرتا ہے یعنی وہ جو بذریعہ غصب امیر ہوا ہو۔ اس قسم میں صفاریہ، سامانیہ، غزنویہ اور بویہ آتے ہیں جنہوں نے کسی ایسے علاقے پر قبضہ کیا جو خلافت کا تھا یا بغیر پہلے سے خلیفہ کی منظوری یا اجازت حاصل کئے کوئی غیر علاقہ فتح کیا اور بعد کو اپنے حق میں ان علاقوں کی سند حاکمیت حاصل کر لی۔ وہ دربار خلافت کو سال بسال باقاعدہ خراج نہیں بلکہ کبھی کبھی تحائف یا اس مال غنیمت کا کوئی حصہ بھیجتے تھے جو بمقابلہ کفار ان کو جہاد میں حاصل ہوتی تھی۔

ان گورنروں کو اپنی قلمرو میں اگرچہ خود مختار فرمانرواؤں کا مرتبہ حاصل تھا تاہم خلیفہ کی سیادت اس حد تک ان کو بھی تسلیم کرنا پڑتی تھی کہ خطبے میں اس کا نام لیں اور سکے پر اس کا نام کندہ کرائیں۔ چونکہ اسلام میں مذہبی اور دنیوی امور کے درمیان کوئی صاف اور نمایاں حد بندی نہیں ہے اس لئے ایسے امیروں کے لئے یہ ناممکن نہیں تھا کہ اپنے اس مذہبی پیشوا کو نظرانداز کریں جو تمام اختیارات کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ اپنی حیثیت کو ازروئے شریعت جائز قرار دینے اور خود اپنے ضمیر کے اطمینان کے لئے اس قسم کے گورنر اپنے حق میں خلیفہ سے سند فرمانروائی حاصل کرتے تھے اور خلیفہ یا ایسے گورنر کی موت پر اس کی تجدید ہوتی تھی، اس وجہ سے ان خود مختار امیروں اور خلفاء کے درمیان مستقل تعلق قائم رہنا ضروری ہو گیا تھا۔

ماوردی کے نزدیک زور و طاقت کے ذریعے امیر وہ شخص ہے جو بغیر خلیفہ کی علم و اجازت اسلحہ کے زور سے ملک پر قبضہ کرتا ہے اور خلیفہ میں چونکہ اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اس امیر کو اس سے باز رکھ سکے اس لئے وہ ان تمام مقبوضات کا انتظام اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

ماوردی کہتا ہے کہ اس صورت میں امیر مستقل فرمانروا ہوگا لیکن امام یا خلیفہ مذہبی پیشوا ہونے کی بنا پر ان تمام احکام کا سرچشمہ سمجھا جائے گا جو مذہب سے متعلق ہوں تاکہ ناجائز اور خلاف آئین امارت جائز اور آئینی ہو جائے۔ بتقاضائے حالات جب یہ مجبوری درپیش آگئی کہ ایسے غاصب فرمانرواؤں کو تسلیم کیا جائے تو ان کے تقرر کے لئے مندرجہ ذیل شرائط وضع کی گئیں جن کا پورا کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔

۱۔ اس کو خلیفہ کا وقار اس حیثیت سے قائم رکھنا چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہے اور اس کا احترام کرنا چاہیئے۔

۲۔ اس کو مذہب کے معاملے میں برملا اور بالاعلان خلیفہ کی اطاعت کرنی چاہیئے تاکہ اس کو کسی طرف سے مخالفت کا شبہ باقی نہ رہے۔

۳۔ اس کو خلیفہ سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں اور اسلام کے مشترک معاملات میں خلیفہ کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ غیروں کی نظر میں اسلام کا وقار قائم رہے۔

۴۔ اس کو مذہبی مراسم قائم رکھنا اور اس کی نگرانی کرنا چاہیئے کہ ان کے متعلق جو احکام دیئے اور فیصلے کئے جائیں وہ خارج نہ ہوں۔

۵۔ اس کو چاہیئے کہ وہی محصولات وصول کرے جو شریعت نے معین کر دیئے ہیں اور ان میں انصاف اور خوش معاملگی برتنے۔

۶۔ اس پر اس کو نظر رکھنی چاہیئے کہ فوجداری کے جرائم میں نیک نیتی سے انصاف کیا جائے۔

۷۔ اس کو چاہیئے کہ دین کی حفاظت کرے، اس کی حوصلہ افزائی کرے، اور تمام ممنوعات سے پرہیز کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ لوگ قوانین شریعت کے

مطیع ہیں تو اس کو چاہیئے کہ وہ ان کو شرعی حقوق دے اور اگر وہ دیکھے کہ وہ ان سے لاپرواہیں تو ان کو اسلام کی دعوت پیش کرے ۔

امارت اور سلطانی

امارت

بغداد میں بویہ کے برسر اقتدار آتے ہی ایک مستقل امارت قائم ہوگئی جس میں توریث کی بنا پر حقوق تھے، اور ان امیروں نے خلیفہ کو تمام باقی ماندہ اعمال حاکمہ اور امتیازات سے عملاً محروم کر دیا۔ انہوں نے تمام اختیارات چھین کر اس کو محض ایک قیدی بنا دیا۔ ان خطبوں تک میں انہوں نے اپنا نام شامل کرایا جو خاص بغداد میں پڑھے جاتے تھے اور خود ساختہ خطابات کے ساتھ سکّے پر ایک طرف اپنے نام درج کرائے اور دوسری طرف خلیفہ کا نام اس طرح رکھا کہ اس کے ساتھ امیر المومنین بھی نہیں تھا۔ انہوں نے خلیفہ کو اس پر مجبور کیا کہ ان کے رشتہ داروں اور طرف داروں کو بعض صوبوں کی سند ولایت اور خود ان کو اور ان کے عزیزوں کو بڑے شاندار خطابات دے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے خود اپنے لئے بڑے بڑے اور قابل اعتراض خطابات ایجاد کئے اور انہیں سکّوں پر لکھوایا۔

اگرچہ بویہ نے عملاً خلیفہ کے تمام دنیوی اختیارات غصب کئے لیکن مصالح کی بنا پر انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ اصولاً بعض کام خلیفہ کے دستخطوں سے ہوں۔ مثال کے طور پر یہ خلیفہ ہی کا خصوصی اختیار رہا کہ وہ مختلف صوبوں

کے گورنروں کو سند تقرر عطا کرے - اس سے خلیفہ اس قابل رہا کہ صوبوں کے والیوں سے اس نے راست تعلقات قائم رکھے - اس کے علاوہ بویہ چونکہ شیعہ تھے اس وجہ سے وہ خلیفہ کے فرائض انجام نہیں دے سکتے تھے لہذا ان کے لئے سلطان کا خطاب منظور نہیں کیا گیا - اس طرح یہ ہوا کہ جو سلطنت انہوں نے قائم کی وہ واقعہ کے طور پر کامل تھی لیکن پوری آزادی کے مرتبے کو نہیں پہنچی اور قانون (شریعت) کی نظر میں ہرگز کامل نہیں ہوئی - اسی طرح اگرچہ غزنویوں نے واقعی سلطانی کا خطاب اختیار کر لیا مگر چونکہ ان کا سیاسی اختیار خارج از بغداد رہا اس لئے ان کا یہ خطاب ضابطے میں تسلیم نہیں ہوا - واقعی سلطانی موجود تھی مگر مغصوبہ، بلا قانونی سند اور ایسی جسے باضابطہ مراسلات میں اور سکّے میں تسلیم نہیں کیا گیا - غزنویہ اور بویہ کا مجموعی طور پر جو عمل و دخل تھا اس سے کسی درجے میں بھی کم کی بنا پر کوئی سُنی فرمانروا ازروئے شریعت سلطان مامور نہیں ہو سکتا - بغداد میں خلافت کی یہ حیثیت و حالت تھی کہ سلجوقی سیلاب کی طرح امنڈ آئے اور انہوں نے غزنویہ اور بویہ دونوں کو بے دخل کر دیا -

سلطنت اور اس کی بنیاد

وہ طغرل بے سلجوقی تھا جس کو سب سے پہلے خلیفہ نے سلطان کا خطاب دیا خلافت کے وہ اختیارات عطا کئے جو امور دنیا سے متعلق تھے - اب بالآخر خلافت ہی سے سلطنت کو آئینی سند حاصل ہو گئی - بغداد میں سُنی سلطنت قائم ہونے کے بعد ادارۂ خلافت کی نئی تاریخ شروع ہوئی - بظاہر خلیفہ کو اپنے شیعی آقاؤں کی غلامی سے نجات مل گئی لیکن سُنی سلطنت بھی خلافت کے لئے

بالکل بلا زحمت نہ تھی ۔ چونکہ اب خلافت محض ایک نام کا عہدہ رہ گیا تھا اس لئے زیادہ طاقتور اور لائق فرمانروا اس کو اس کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے تھے ۔ لیکن محض اس وجہ سے اس کا وجود گوارہ کیا گیا کہ خاندان عباسیہ کے ساتھ ایک تقدس وابستہ تھا، اور اس عہدے کے لئے اس کا دعوے فرضی روایات پر مبنی تھا، اور دوسری طرف خلافت کے دینی اور دنیوی فرائض میں کوئی قطعی تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا سیاسی اور قانونی وجود اس قدر پیچیدہ ہو گیا تھا کہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے باقی رکھا جائے۔ اگر سچا انتخاب ہوتا تو کوئی شک نہیں کہ عہدہ خلافت کے لئے کوئی لائق ترین اور موزوں ترین شخص ضرور منتخب ہو جاتا مگر اس کی عدم موجودگی میں طبعی عوامل نے کام کیا اور جو سب سے زیادہ طاقتور تھا اس نے اپنا اختیار جتایا اور اقتدار کا دعوے کیا ۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت جیسی ہو گئی تھی اس کا لازمی نتیجہ سلطنت ہی تھا۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ خلافت قائم رکھی جائے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری کہ سلطانی کے لئے جگہ پیدا کی جائے ۔ اس ناگوار حالت سے نکلنے کے لئے ایک درمیانی راہ نکالی گئی ۔ سلطانی کو اس حیلہ شرعی سے جائز قرار دیا گیا کہ خلیفہ بذات خود کسی کو سند سلطانی عطا کرے جو محض ایک رسمی بات تھی اور اس سلطانی کے جواز کے لئے جو واقعی طاقت سے قائم تھی ایک آئینی دھوکہ ۔

اب خلافت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسا سلطان خلیفہ کے پہلو میں کھڑا ہوا جو از روئے قانون مامور کیا گیا اور اس کا اقتدار تلوار کے زور سے قائم تھا اور وہ سوائے تلوار کے اور کسی طرح ہٹایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

حیثیتی سلطان کے لئے صرف یہی نہیں تھا کہ وہ شرائط پوری کرے جو مسلمان فقیہوں نے غاصب امیر کے لئے معین کر دی تھیں بلکہ اس سے یہ توقع بھی تھی کہ وہ تمام فرائض انجام دے جو خلیفہ کے لئے معین تھے۔ جب تک سلطان یہ تمام فرائض انجام دے اور ملک کا انتظام شریعت کے مطابق کرے اور لوگوں کے لئے امن وسلامتی مہیا کرے، کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے خلاف انگلی بھی اٹھائے۔

سلطانی کے اصول

سلجوقیوں کے عہد میں لفظ سلطان نے نئے معنے اختیار کر لئے۔ اس کی کوشش کی گئی کہ اس کے معنے صرف اس حد تک محدود کر دئے جائیں کہ خلافت کے دنیوی اختیار کا پورا مالک۔

نظام الملک نے اپنی مشہور کتاب سیاست نامے میں شاید مذکورہ بالا مفہوم ہی کو صحیح اور سلطانی کو از روئے قانون جائز قرار دینے کے لئے سلطانی کا اصول وضع کرنے کی کوشش کی۔ نظام الملک نے بادشاہی کا جو نظریہ پیش کیا ہے اگر اس کو سطحی نظر سے دیکھئے تو یہ اثر قائم ہوتا ہے کہ بادشاہی کا حق اللہ کی طرف سے ہے اور غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ اس عقیدے سے مشابہ ہے جو قبل از اسلام فارس کے بادشاہوں کے متعلق تھا لیکن اگر تنقیدی نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ غلط فہمی رفع ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قبل از اسلام فارس کے بادشاہ اپنے آپ کو خدا کہتے تھے اور قانون سے بالا لیکن نظام الملک نے سلطان کے ہاتھ اور پیر شریعت کی رسی سے باندھ دیئے۔ اسلام سے قبل جو فارس کے بادشاہ تھے ان کے احکام کی خلاف ورزی کا کسی

کو جیاں بھی نہیں آسکتا، اس کی سزا موت تھی لیکن قانون کی پابندی کے معاملے میں نظام الملک نے فرمانروا اور رعایا دونوں کو برابر کے درجے میں رکھا ہے۔

دوسری طرف اس کا اصول ماوردی کے اصول کی بالکل ضد ہے۔ ماوردی کی رائے یہ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب ہونا چاہیئے اور وہ عوام کو جواب دہ ہے جن کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ اپنے فرائض واجبی طور پر انجام نہ دے تو وہ اس کو معزول کر دیں۔ نظام الملک یہ بالکل نہیں سوچتا۔ اسلامی اصول سے اس کے انحراف کا سبب یہ ہے کہ جس صورت حال میں وہ تھا اس کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اس کے لئے ماوردی کی روش اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

نظام الملک کا مقصد خاص یہ تھا کہ سلطانی کے لئے خود اسی کے حقوق کے تحت ایک دائرۂ عمل معین کر دے جس کی ذمہ داری اس کے ماورا کسی دوسرے پر نہ ہو اور اس کے ساتھ خلافت بھی مسلمہ مذہبی ادارہ رہے چونکہ سلطان نے اختیار فرمانروائی اصولاً خلیفہ سے حاصل کیا تھا اس لئے اس کا عہدہ نہ انتخابی ہو سکتا تھا اور نہ وہ عوام کو جواب دہ ہو سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ نظام الملک کی یہ کوشش کوئی ایسا درمیانی راستہ پیدا کرنے کے لئے تھی کہ خلیفہ مذہبی پیشوا بھی رہے اور سلطان کا اختیار بھی احکام الہیٰ کے مطابق سمجھا جائے۔

سلطانی کا نمو

جب سلطان محمود کو سنجر کے ہاتھ سے شکست ہوئی تو سنجر نے ۵۱۱ھ

مطابق ۱۱۱۹ء میں بغداد کا شہنشاہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے بعد سے سنجر باضابطہ سلطان ہو گیا اور اس کا نام خطبوں میں لیا جانے لگا اور سکوں میں کندہ ہوا اور یہ صرف بغداد ہی میں نہیں بلکہ ان تمام ممالک میں جو سلجوقیوں کے تحت حکومت تھے۔

تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ بغیر بغداد پر قابض ہوئے کسی فرمانروا کو یہ عزت حاصل ہوئی ہو۔ اس سے ایک نظیر قائم ہو گئی جس کی بناء پر بعد میں دوسرے طاقتور فرمانرواؤں نے یہ مطالبہ کیا کہ بغداد کے خطبوں میں ان کا نام لیا جائے۔ مزید پیچیدگی اس سے پیدا ہوئی کہ جو فرمانروا بغداد پر قابض تھے وہ بھی سلطان ہی کہلاتے تھے۔ نتیجے میں یہ ضروری ہو گیا کہ ان کے نام بھی خطبے میں لئے جائیں اور سکے میں کندہ ہوں، کیونکہ وہ واقعی بادشاہ تھے۔

جب سلطان سنجر نے اپنے بھتیجے محمود سے صلح کر لی تو اس نے اس کو اپنا ولیعہد بنا دیا اور یہ حکم جاری کیا کہ تمام سلطنت اسلامیہ کے خطبوں میں اس کا نام داخل کیا جائے، اور بعد میں اس نے خلیفہ کو اس کی اطلاع کر دی۔ خلیفہ کے اختیارات خصوصی پر سلطان کی طرف سے یہ انتہائی دست درازی تھی۔ اس وقت یہ سلطان سنجر کے اختیار میں تھا کہ عراق کی حکومت جس کو چاہے دیدے لیکن اس معاملے میں خاص بغداد کی حکومت بھی شامل ہو گئی تھی لہذا شہزادہ کو خلیفہ کی اطاعت کا حلف اٹھانا پڑا اور اس کے عوض خلیفہ نے اس کو پروانہ تقرری دیا۔ جب سلطان محمود کا انتقال ہوا اور تخت کے لیے جنگیں ہوئیں تو صورت حال پیچیدہ ہو گئی۔ تمام متحارب فریقوں نے سلطان سنجر سے بھی مدد چاہی اور خلیفہ سے بھی کیونکہ سنجر واقعی

عراق کا شہنشاہ تھا اور خلیفہ معناً اور اصولاً۔ چونکہ بغداد کے خطبوں میں سلاطین کے لئے اس وجہ سے دعا کی جاتی تھی کہ وہ واقعی شہر کے حاکم تھے، ان کی سلطانی رفع ہونے پر ان کے نام خطبوں میں نہیں لئے جاتے تھے۔ لیکن سلاطین بغیر جھگڑے کے یہ رائے قبول کرنے والے نہ تھے۔ جب نئے سلطان محمد کو یہ امتیاز دینے سے انکار کیا گیا تو اس نے اس پر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ ہوشیار خلیفہ اس کے حملے کا مقابلہ کرنے کو بالکل تیار تھا، مگر پھر سفارتی ذرائع سے خلیفہ نے سلطان کو محاصرہ اٹھانے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح بغداد جنگ کی تباہی سے بچ گیا اور پھر کسی سلجوقی سلطان نے بغداد پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

جب اس خاندان کے آخری فرمانروا سلطان ارسلان نے یہ درخواست کی کہ بغداد کے خطبوں میں اس کا نام داخل کیا جائے تو سفیر کو ذلت کے ساتھ نکلوا دیا گیا۔ سلطان طغرل سلجوقی نے بغداد پر اپنے خاندان کی سلطانی دوبارہ قائم کرنے کی کوشش میں یہ چاہا کہ خلافت کو اس کے دنیوی اقتدار سے محروم کر دے اس پر اس سلطان اور خلیفہ ناصر کے درمیان جو بڑا زوردار تھا سخت تصادم ہوا اور اس میں خلیفہ کو یہ فتح ہوئی کہ اس کے محل کے پھاٹک پر سلطان طغرل کا سر لٹکا دیا گیا۔ (۵۹۰ھ مطابق ۱۱۹۴ء)

سلطانی کے نتائج

سلجوقیوں سے اپنے دنیوی اختیار کے لئے طویل کشمکش میں خلفائے عباسیہ اتنا کر سکے انہوں نے اپنے لئے ایک چھوٹی سی خودمختار حکومت قائم کر لی جس میں ان کو صرف مذہبی نہیں بلکہ دنیوی اقتدار بھی

حاصل تھا۔ اسی زمانے میں یہ بھی ہوا کہ ایران سے ان کا دنیوی اقتدار بالکل مٹ گیا۔ چونکہ خلیفہ نے سلطان کو کلی طور پر دنیوی اختیار عطا کر دیا تھا اور وہ اس کا مجاز تھا کہ وہ حدود سلطنت اسلامیہ کے اندر جو ملک چاہے کسی کو دے دے اس لئے دوسرے فرمانروایان فارس سے خلیفہ کے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے۔

فارس کے مختلف خود مختار فرمانروا اب راست خلیفہ سے سند تقرری حاصل نہیں کرتے تھے اس لئے ان کو خلافت سے کوئی سیاسی تعلق باقی نہیں رہا۔ مختلف اوقات میں تخت کے لئے ان کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان میں اپنی تقویت کے لئے بھی کسی فریق نے خلیفہ سے تائید نہیں چاہی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ محض فتح کے حق کی بنا پر حکومت کرتے تھے۔ وہ یا اس سلطان کی اطاعت کرتے تھے جس سے وہ حکومت پاتے تھے یا جب ممکن ہوتا تھا اس سے آزادی حاصل کر لیتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ سلجوقیوں کے زمانے میں یہ معمول ترک ہو گیا تھا کہ ہر نیا سلطان اپنی تقرری کی سند دوبارہ خلافت سے حاصل کرے۔ اس کی ضرورت صرف اس وقت محسوس ہوتی تھی جب کوئی نیا خاندان برسر اقتدار آتا تھا۔ سیاسی اعتبار سے فارس کے ساتھ خلیفہ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ سیاسی اثر کا جو ایک دھوکہ سا سابقہ حکومتوں میں رہا اب وہ بھی ختم ہو گیا۔ بے شک یہ فرمانروا ابھی خطبوں میں خلیفہ کا نام پڑھواتے رہے اور مروجہ سکوں میں درج کراتے رہے لیکن یہ اظہار اطاعت محض ایک روایتی معمول تھا جو آپ سے آپ واقع ہو رہا تھا خلیفہ کی دنیوی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ صرف مذہبی روایت کے زور سے یہ معمولات زندہ تھے لہذا یہ

بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے فرمانروایان فارس کے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں تھا کہ عباسی خلافت کو مذہبی حیثیت سے تسلیم کیا جائے یا سیاسی حیثیت سے۔ سلجوقی عہد حکومت کی دوسری اور سیاسی اعتبار سے نہایت اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ادارۂ خلافت کے دینی اور دنیوی ... بالکل الگ الگ ہو گئے تھے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ خلافت نے بطیب خاطر امور دنیا کے متعلق اپنے تمام اختیارات ایک سلطان کے حوالے کئے جو اس واقع کے بعد خلافت کے دنیوی کا حاکم اعلےٰ تصور کیا گیا

عطابیگ آخری سلطان سلجوقی نے جو مندرجہ ذیل خیالات ظاہر کئے وہ اسی کا نتیجہ تھے کہ خلیفہ نے سلطان کو امور دنیا کے اختیارات منتقل کر دیئے تھے "خلیفہ کو امام کی حیثیت سے یہ چاہیئے کہ نماز اور مذہبی عبادت میں مصروف رہے کیونکہ یہ دین کی بنیاد ہے اور سب سے بہتر فرائض ہیں جہاں تک امور دنیا کا تعلق ہے وہ سلطان کو منتقل ہو جانے چاہییں یہ خیالات مبالغے پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اس صورت حال کا بیان ہیں جو پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری طرف جب کوئی طاقتور خلیفہ مسند خلافت پر آیا تو قطرتاً وہ اس طرف مائل ہوا کہ سلطانی کو تسلیم نہ کرے اور اپنی سابقہ حیثیت واپس لے۔

سلجوقی عہد میں آخری تین خلفاء نے یہی کیا۔ مگر ایک بات جس کی تردید نہیں کی جا سکتی یہ تھی کہ قانون میں یہ عملی نوعیت کی ایک جدت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر سلطان میں یہ طاقت ہو کہ وہ کسی چیز کا دعوے کرے اور حاصل کر کے اپنے قبضے میں اس طرح رکھ سکے کہ قانونی جواز اور سابقہ نظیر

کی نمائش قائم رہے تو خلیفہ اس کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اپنی نظیر کی قوت پر ہوا کہ خوارزم شاہ نے، جو فارس میں سلجوقیوں کا سیاسی وارث تھا ان تمام امتیازات کا دعوے کیا جو اس کے پیش رو سلجوقیوں کو حاصل تھے اور خلافت سے مسلسل جھگڑتا رہا۔

سلطانی اگرچہ خود اب اپنے استحقاق پر قائم تھی مگر پھر بھی سلاطین اس حیثیت کی تمنا کرتے تھے جو پہلے سلجوقیوں کو بغداد میں حاصل تھی۔ خلفاء جنہوں نے کسی حد تک اپنی سابقہ حیثیت پھر پا لی تھی، صرف یہی نہیں کہ سلاطین کے مطالبات منظور کرنے کو راضی نہیں تھے، بلکہ اس کے لئے کوشاں تھے کہ جس قدر زیادہ رقبے پر ہو سکے، اپنا سیاسی اقتدار قائم کریں۔ یہی بات آگے چل کر خلیفہ اور سلطان کے درمیان بنائے مخاصمت بن گئی۔ سیاسی اقتدار کے لئے ان کی باہمی رقابت اور مسلسل جنگیں اس کا باعث ہوئیں کہ کافر مغلوں نے مسلمانوں کے ملک پر فوج کشی کی۔ خوارزم شاہ کا ملک فتح کر کے انہوں نے فارس میں سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کے بعد بغداد میں خلافت کا۔

ثقافتی تنصیبات

مسلمانان عہد ابتدائی کی ذہنی سرگرمیاں دو عنوانات کے تحت تقسیم کی گئی ہیں:۔ پہلی وہ ہیں جو عربی مزاج اور میلان سے پیدا ہوئیں یعنی دینیات فقہ، فلسفہ اور تاریخ اور دوسری وہ ہیں جو انسانی طبیعت کے اس فطری تقاضے سے پیدا ہوئیں کہ علم حاصل کیا جائے۔

ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے: فلسفہ، ہیئت، نجوم، طب، ریاضی

طبیعیات، ادب اور جغرافیہ۔

مسلمانوں کو اس کی فوری ضرورت تھی کہ قرآن اور حدیث کے اصولوں کے مطابق دنیائے اسلام کے لئے ایک عظیم معاشرتی سیاسی نظام مرتب کریں۔ اسی مقصد سے مسلمان علماء ان علوم کی طرف متوجہ ہوئے جو پہلے عنوان کے تحت میں ہیں اور ان میں انہوں نے امتیازی عظمت حاصل کی۔ لیکن بغداد کی بے اندازہ دولت کے ساتھ تفریح کا ذوق بھی پیدا ہوا حسن و جمال کے ساتھ شغف اور بقول جوزف ہیل[1] تلاش حق کا جذبہ بھی جو علم کی طلب میں سب سے زیادہ بلند اور شریف ترین ہے۔

"فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے ہر علم متبرک ہے۔ اللہ کا عطیہ اور اس میں کوئی چیز ناپاک نہیں ہے۔ یہ اسلام کی امتیازی شان ہے کہ اس نے دوسری فہرست کے علوم کو نہ ذلیل سمجھا اور نہ نظر انداز کیا۔" جوزف ہیل ہی پھر کہتا ہے: "اسلام نے جس گھر میں دینیات کو جگہ دی اسی میں ان علوم کو بھی رکھا اور وہ گھر مسجد تھی۔ اسی سے اس نظام تعلیم کی طرف ہماری رہنمائی ہوتی ہے جو عباسی عہد حکومت میں قائم تھا۔"

نظام تعلیم

خلفائے راشدین کے عہد میں عرب کے مختلف حصوں اور مفتوحہ صوبوں میں قرآن کی تعلیم کے مدرسے قائم کئے گئے۔ بعد کو نصاب تعلیم میں صرف و نحو اور حفاظت بھی داخل کی گئی۔ عہد عباسیہ میں یہ ابتدائی مدرسے عموماً بڑی مسجدوں میں ہوتے تھے اور خلافت کے تمام طول و عرض میں ان کا

---

[1] Joseph Hell.

جال بچھا ہوا تھا علم کی طلب اس قدر عام تھی کہ بغیر حکومت کی طرف سے کسی اقدام کے ایک جبری نظام مدارس پیدا ہو گیا۔ معمولاً چھ سال کی عمر میں لڑکے اور لڑکیاں مدرسوں میں داخل ہو جاتے تھے، اور استادوں کی تنخواہیں مسلمان اجتماعی طور پر دیتے تھے۔

ابتدائی مدرسہ اگر بالکل ہی مسجد میں نہیں تو مسجد سے متعلق اور متصل کسی عمارت میں ہوتا تھا۔ اس کے نصاب تعلیم کا مرکز قرآن ہوتا تھا پڑھنے کے ساتھ لکھنا بھی سکھاتے تھے۔ دوسری چیزیں یہ تھیں:۔ عربی صرف و نحو، قصص الانبیاء، خصوصاً وہ حدیثیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہیں، ریاضی کے ابتدائی اصول، نظمیں مگر عشقیہ ہرگز نہیں۔ پوری نصاب تعلیم میں جانچنے پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ امراء کی تعلیم میں کیا پسند کیا جاتا تھا اس کا اندازہ ہارون الرشید کی ان ہدایات سے ہو سکتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے امین کے استاد کو دیں۔

" اس کے ساتھ نہ اتنی سختی کرنا کہ اس کی طبعی صلاحیتیں ماری جائیں اور نہ اتنی نرمی کہ یہ کاہل ہو جائے اور اس کا عادی۔ شفقت اور نرمی سے تو اس کو جتنا سیدھا کر سکے کر لیکن اگر یہ توجہ نہ کرے تو سختی اور زور سے بھی باز نہ رہ۔"

استادوں کی بڑی عزت تھی۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی کوئی ایسی ہی تنظیم تھی جیسی گلڈ کی ہوتی ہے۔ اور اساتذہ اس کے مجاز تھے کہ جوان سے یا ان کی نگرانی میں تعلیم پائیں ان کو سند (اجازۃ) دیں۔ زرنجی نے علم آموزی کے فن پر ۱۲۰۳ء میں ایک رسالہ لکھا ہے جس کا ایک حصہ اس نے اس کے لئے وقف کیا کہ طلبہ کو استاد کا کتنا احترام کرنا چاہیئے اور اس سلسلے

ہیں اس نے ایک قول نقل کیا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے منسوب ہے "جس نے مجھے ایک لفظ بھی پڑھایا ہیں اس کا غلام ہوں۔"

اعلےٰ تعلیم کے ادارے

اسلام ہیں اعلےٰ تعلیم کا سب سے پہلا ادارہ بیت الحکمت تھا جو مامون نے (سنہ۸۳۰ء) اپنے دار الخلافت بغداد ہیں قائم کیا۔ اس ہیں ایک ترجمے کا شعبہ تھا، عام کتب خانہ تھا اور رصدگاہ تھی۔ رصدگاہیں جو اس زمانے ہیں بہت قائم ہو گئیں تھیں۔ نجوم کی تعلیم کے ایسے ہی مدرسے تھیں جیسے وہ شفاخانے طب کی تعلیم کے جو اسی زمانے ہیں زیادہ قائم ہوئے لیکن وہ پہلا دار العلوم جس نے طلبار کی جملہ ضروریات مہیا کیں اور بعد ہیں اعلےٰ تعلیم کے اداروں کے لئے نمونہ بنا نظامیہ تھا۔ یہ الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے بیدار مغز اور روشن خیال وزیر نظام الملک نے سنہ ۶۷-۱۰۶۶ء ہیں قائم کیا تھا۔

بویہ اور دوسرے غیر عرب سلاطین کی طرح، جنہوں نے خلافت کے اختیارات غصب کئے تھے سلجوق بھی علم و حکمت کی سرپرستی ہیں دوسروں سے مسابقت کرتے رہے۔ نظامیہ کی توجہ کا مرکز دینیات تھا اور اس ہیں خصوصیت سے فقہ شافعی اور طریقۂ اشاعرہ۔ قران اور عہد جاہلیت کی شاعری اسی طرح نظامیہ ہیں علم و ادب کی جان تھی جیسے بعد کو یورپ کی یونیورسٹیوں ہیں معیاری ادب بنا۔ اس دار العلوم ہیں طلبہ کو کھانا دیا جاتا تھا اور بہت سوں کو وظائف بھی۔ یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ نظامیہ کی بعض تفصیلی تنظیمات معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی قدیم یونیورسٹیوں کی نقل تھیں۔ ایک

واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ میں ایک اجتماعی عصبیت بھی تھی۔ دربار کا کوئی نمائندہ کسی عالم کے کمرے کا دروزاہ بند کرکے اس پر مہر لگانے کے لئے آیا۔ طلبہ نے اس کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ یہ عالم ۱۱۸۶ء میں مرا اور اس کا کوئی وارث نہ تھا۔

نظامیہ وہ دینی دارالعلوم تھا جس کو حکومت تسلیم کرتی تھی۔ ابن اثیر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی استاد (پروفیسر) کا تقرر ہوا مگر جب تک خلیفہ نے اس کی توثیق نہ کردی اس وقت تک وہ تعلیم نہیں دے سکا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی پروفیسر کا تقرر ہوتا تھا اس کے ماتحت دو ایسے استاد ہوتے تھے جو درس ختم ہونے کے بعد اسی کی تقریر ایسے طلبہ کے سامنے دہراتے تھے اور اس کی تشریح کرتے تھے جو کم ذہین ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ابن جوبیر نے ایک بڑے عالم استاد کی تقریر میں شرکت کی جو ظہر کے بعد ہوئی تھی۔ وہ ایک چبوترے پر کھڑا ہوا اور طلبہ اسٹولوں پر بیٹھے تھے۔ طلبہ نے عصر کے وقت تک اس پر تحریری اور زبانی سوالات کی بوچھار رکھی۔ اسی نظامیہ میں غزالی نے چار سال درس دیا (۱۰۹۱-۹۵ء)۔ امام غزالی نے احیاء العلوم کے باب علم میں جس سے انہوں نے اس کتاب کا آغاز کیا ہے اس خیال کی سخت مخالفت کی ہے کہ تعلیم کا مقصد علم سکھانا ہے اور اس ضرورت پر زور دیا ہے کہ طالب علم کے اخلاقی شعور میں حرکت پیدا کی جائے اس طرح وہ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے عمیق اخلاقی نظام کے ساتھ مسئلہ تعلیم کا وہ تعلق پیدا کردیا جو جسم اور اعضاء کے درمیان ہوتا ہے۔

النظامیہ بعد میں مستنصریہ کے ساتھ ضم ہوگیا (۱۲۳۹ء)۔ یہ خلیفہ

مستنصر کے نام پر تھا جس نے ۱۲۳۳ء میں یہ فقہ کے چاروں اماموں کے مذاہب کی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا۔ مستنصریہ کی عمارت کے دروازے پر گھڑی لگی ہوئی تھی اس میں کتب خانہ تھا اور حمام، باورچی خانے اور شفاخانے تھے۔
ان ذہنی سرگرمیوں کی ترقی کے ساتھ سلطنت ایسے بڑے شہروں میں کئی یونیورسٹیاں پیدا ہوگئی تھیں جیسے بصرہ، کوفہ، دمشق، بغداد، نیشاپور حرّان، مرو وغیرہ۔

عام طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی تک یونیورسٹیوں کا خاص مقام مسجدیں تھیں جن میں اساتذہ کو اظہار خیال اور ہر مسلمان کو ان میں داخل کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ تعلیم کے اس عام انداز کے ساتھ سند کی کوئی قدر نہیں تھی۔ معیار تعلیم کی بلندی کی ضمانت بڑی حد تک استاد کی ذاتی قابلیت اور جو فن پڑھایا جاتا تھا اس پر اس کا عبور ہوتا تھا۔

جن ذرائع سے بھی ہم تک یہ معلومات پہنچی ہے ان سے اندازہ کر کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان یونیورسٹیوں میں تعلیم کا طریقہ بھی معلمانہ تھا جو اب مغربی ملکوں میں مقبول ہو رہا ہے۔ یہ بات عرب سویلیزیشن[1] کے مصنف جوزف ہیل[2] کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی واضح ہوتی ہے:

"اور ان تقریروں میں جتنی نہیں، جو جہالت کے ساتھ سوچتے ہوں بلکہ سلطنت کے ہر حصے سے مسلمان علماء آتے تھے۔ سامعین میں سے ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ پروفیسر اور لیکچرر سے سوال کرے اور وہ لیکچرر

---

[1] Arab Civilization.

[2] Joseph Hell.

جو جواب دینے اور سائل کو مطمئن کرنے سے قاصر رہتا تھا فوراً ذلیل اور بے اعتبار ہو جاتا تھا۔ ہر استاد کے دن اور گھنٹے مقرر ہوتے تھے۔ دوسری طرف لیکچروں کے لئے وقت کا کوئی تعین نہیں تھا۔ یہ بالکل لیکچرر کے اختیار میں تھا کہ وہ کسی مضمون کے لئے لیکچروں کی جو تعداد چاہے مقرر کرے تقریر بالعموم کتابوں پر مبنی ہوتی تھی خواہ وہ کتاب لیکچرر ہی کی تصنیف ہو یا کسی دوسرے کی۔ تقریر آہستہ آہستہ کی جاتی تھی اور سامعین اسے لکھتے رہتے تھے۔

سوالات کر کر کے لیکچرر اس کا اطمینان کرتا جاتا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے سننے والے اسے سمجھ رہے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے چبوترے سے اُتر کر سامعین میں آبیٹھتا تھا اور ان سے مضمون پر گفتگو کرتا تھا۔"

سائنس کی تدریس میں جس چیز نے مسلم علماء کو خصوصیت سے ممتاز کیا وہ محلیے پر اصرار تھا یعنی حقیقی معنے میں حکمت کا ذوق۔ سیڈیلاٹ[1] یہ شہادت دیتا ہے کہ "بغداد کے مکتب حکمت سائنس کی ابتداء سے یہ خصوصیت رہی کہ اس میں ذوق حکمت تھا یعنی (۱) وہ معلوم سے نامعلوم کی طرف بڑھتا تھا۔ (۲) وہ کسی ایسی بات کو صحیح سمجھتا ہی نہ تھا جس کی تجربے سے تصدیق نہ ہو جائے یا ان مسلمہ اصولوں سے جو فن حکمت کے استادوں نے تعلیم کئے ہوں یا جن کی انہوں نے تائید کی ہو۔"

گیارھویں صدی تک جب سلاطین نے مدرسے قائم کئے، معلم قاضیوں کی حیثیت سے حکومت کی خدمت کر کے اپنی معاش حاصل کرتے تھے یا کسی قسم کی تجارت و دستکاری سے۔ جو مدرسے سلاطین اور شہزادوں

---

[1] Sedillat.

نے قائم کئے ان میں معلموں کو تنخواہیں ملیں۔ مگر حق تصنیف کا خاص انتظام تھا اس کی وجہ سے اساتذہ کو اکثر سخت دشواریوں کا سامنا رہتا تھا۔ کوئی شخص کسی مصنف کی کتاب بغیر اس کی تحریری اجازت کے عوامی تقریر میں استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ مصنف کے انتقال کے بعد بھی اس کے حق تصنیف کے مالک اس کے ورثاء ہوتے تھے لہذا اس کی کتاب سے کام لینے کے لئے ورثاء کی اجازت ضروری ہوتی تھی۔ لیکن یہ بات تعلیم کی اشاعت میں مانع نہیں آئی۔ اس سے جدت فکر اور تازہ علمی تحقیق کے لئے ولولہ پیدا ہوا۔

دینیات کی اعلیٰ تعلیم کے ان اداروں میں نصاب تعلیم کی بنیاد فن حدیث پر ہوتی تھی اور حفظ پر خصوصیت سے بڑا زور تھا۔ حافظے کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ امام غزالی کو تین لاکھ حدیثیں یاد تھیں، امام احمد ابن حنبل کو دس لاکھ اور امام بخاری کا سو حدیثوں میں امتحان لیا گیا، جن میں ایک حدیث کے راویوں کا سلسلہ دوسری حدیث کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔

تعلیم بالغان ایسے نظم کے ساتھ کہیں نہیں ہوئی جیسی مسجدوں میں۔ تمام مسلم شہروں کی مسجدیں اہم تعلیمی مرکز تھیں۔ جب کوئی مسافر کسی نئے شہر میں پہنچتا تو وہ اس کامل یقین کے ساتھ جامع مسجد کا رخ کرتا تھا کہ وہاں حدیث کا درس ہو رہا ہوگا۔ ان اجتماعات میں صرف مذہبی مضامین پر نہیں بلکہ شعر و شاعری اور زبان پر بھی گفتگو ہوتی تھی۔ مسجدوں کی ان تقریروں میں ہر مسلمان آزادی سے شریک ہوسکتا تھا اور یہ گیارہویں صدی تک اسلام کے اضافی مدرسے رہیں۔

مسجدوں کے حلقوں سے ان کی دوسری نوعیت یاد آئی۔ یہ وہ اجتماعات

تھے جو امرار اور نفاست پسند لوگوں کے گھروں پر مجلس ادب کے نام سے منعقد ہوتے تھے - یہ اجتماعات عباسیوں کے ابتدائی دور میں شروع ہوئے۔ ابتدائی دور کے ایسے کئی خلیفہ تھے جن کی موجودگی میں مشاعرے، مذہبی مباحثے اور ادبی جلسے ہوتے تھے -

کتب خانے

مسجدوں نے خزینہ کتب کی بھی خدمت انجام دی۔ عطیوں اور وقف کے ذریعے مسجدوں کے کتب خانے دینی کتابوں سے بھر گئے۔ دوسرے کتب خانے امرار اور صاحب دولت لوگوں نے قائم کئے جن میں منطق، فلسفے، ہیئت اور حکمت کے دوسرے شعبوں پر کتابیں مجتمع کی گئیں - یہ نیم عوامی تھے - اور علمار اور نمود کے آدمیوں کے لئے نجی کتب خانوں سے بھی فائدہ اٹھانا مشکل نہیں تھا -

دسویں صدی کے وسط سے قبل موصل میں ایک کتب خانہ تھا جو وہیں کے کسی باشندے نے قائم کیا تھا - اس میں طالب علموں کو کاغذ مفت دیا جاتا تھا - شیراز میں خاندان بویہ کے عضد الدولہ نے (۸۲ - ۹۷۷) کتب خانہ قائم کیا - اس کی کتابیں خانوں میں ترتیب کے ساتھ رکھی گئیں، ان کی فہرست تھی اور باضابطہ عملہ اس کا انتظام کرتا تھا - اسی صدی کے اندر بصرے میں بھی کتب خانہ تھا - اس کا مالک ان کو وظائف دیتا تھا جو اس میں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کرتے تھے - اسی وقت رے میں ایک کتب خانہ تھا جس میں اتنی کتابیں تھیں کہ ان کو لادنے کے لئے چار سو اونٹ درکار تھے، اور دس جلدوں میں ان کی فہرست تھی - کتب خانوں میں

لوگ سائنس پر گفتگو اور مباحثوں کے لئے بھی جمع ہوتے تھے۔

کتابوں کی دوکانیں

تعلیمی اور تجارتی ایجنسیوں کی حیثیت سے کتابوں کی دوکانیں اوائل عہد عباسیہ میں منظر عام پر آئیں۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ اس کے زمانے میں (۸۹۱ء) دار لخلافت کو یہ فخر حاصل تھا کہ سو سے زیادہ کتب فروش ایک سڑک پر بیٹھتے تھے۔ کتب فروش خود خطاط ہوتے تھے، کتابیں نقل کرتے تھے اور ان کی دوکانیں صرف دوکانیں ہی نہیں بلکہ علمی بحث و گفتگو کے مرکز ہوتی تھیں۔ ندیم جو ورّاق کے لقب سے بھی مشہور ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود بھی کتب خانے کا مالک تھا یا کتب فروش۔ اسی کی فہرست کتب سے اس عالمانہ اور عظیم تالیف کا پتہ چلا جس کا نام فہرست ہے۔ اس میں اس عراقی کا بھی ذکر ہے جس کے بہت بڑے صندوق میں مخطوطات کا خزانہ تھا۔ یہ چمڑے پر مصری کاغذ پر اور چینی کاغذ پر تھیں۔ ان میں سے ہر ایک پر کاتب کا نام اور پانچ سے چھ پشتوں تک اس کے صاحب علم بزرگوں کے نام درج ہوتے تھے۔

عباسی حکومت میں غیر مسلم

عباسیوں کے برسر اقتدار آنے سے ذمیوں کی حالت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا۔ چونکہ عباسی احکام قرانی پر عامل تھے اس لئے غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ میں ان کا وہی طرز عمل رہا کہ "لا اکراہ فی الدین" ابتدا میں اہل کتاب کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ عیسائی، یہودی، صابی، زردشتی، مانوی، حران کے صابی اور دوسرے سب کے ساتھ ذمیوں کا سا برتاؤ تھا۔ دیہات میں اور

اپنے کھیتوں پر یہ ذمی اپنے ہی ثقافتی طرز پر رہتے تھے اور اپنی ہی زبانیں بولتے تھے:
ارامی اور سوری شام اور عراق میں، ایرانی فارس میں اور قبطی مصر میں۔

شہروں میں بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی حیثیت مالی اعتبار سے پیشوں میں اور منشی گری میں اہم تھی۔ خلیفہ معتصم کی ملازمت میں دو عیسائی تھے جو باہم حقیقی بھائی تھے۔ ان پر امیر المومنین کو اس قدر اعتماد تھا کہ سلمویا تو دورحاضر کی اصطلاح میں سیکریٹری آف اسٹیٹ تھا اور اس وقت تک کوئی شاہی کاغذ ضابطے میں جائز نہیں ہوتا تھا جب تک کہ اس پر دوسرے دستخط اس کے نہ ہوں، اور ابراہیم کے پاس خلیفہ کی مہر رہتی تھی اور بیت المال کا وہ افسر اعلیٰ تھا حالانکہ کام اور خزانے کی نوعیت کے اعتبار سے اس عہدے پر کوئی مسلمان ہونا چاہیے تھا۔ اس ابراہیم سے خلیفہ کو اس قدر محبت تھی کہ اس کی بیماری میں خلیفہ عیادت کو گیا، اس کی موت پر اس کو بڑا غم ہوا اور اس کی تجہیز و تکفین کے دن اس کی لاش خلیفہ نے اپنے محل میں منگائی اور وہیں بڑے احترام کے ساتھ مسیحی مراسم ادا ہوئے۔

خلیفہ معتضد کے عہد حکومت (۸۹۲ء۔ ۹۰۲ء) انمبر کا گورنر عمر بن یوسف عیسائی تھا اور خلیفہ نے اس کا تقرر اس بنا پر کیا کہ اگر کوئی لائق عیسائی ملے تو اس کو بھی بڑا عہدہ دیا جا سکتا ہے۔ خلیفہ الموفق نے جو اپنے بھائی معتمد کے عہد حکومت میں (۸۷۰ء۔ ۸۹۲ء) عملاً فرماں روائی کرتا تھا، فوج کا انتظام ایک عیسائی مسمی اسرائیل کے سپرد کر دیا اور اس کے بیٹے المعتضد کا کاتب (سیکریٹری) ایک دوسرا عیسائی ملک بن دلید تھا۔ المقتدر کے عہد حکومت (۹۰۸ء۔ ۹۳۲ء) میں ایک عیسائی صاحب دفتر فوج تھا۔

Saimuyah. ط

عزالدولہ بو ویہہ (۹۴۹ء - ۹۸۲ء) کا وزیر اعظم ناصر ہارون جو جنوبی فارس اور عراق پر حکمران تھا عیسائی تھا - عرصہ دراز تک حکومت کے عہدوں پر اور بالخصوص محکمہ مال میں عیسائی اور پارسی رہے - مصر میں بہت دیر تک اس قسم کے عہدے بالکل عیسائیوں ہی کے لئے مخصوص رہے - طبیبوں کی حیثیت سے عیسائیوں نے بڑی دولت جمع کی اور ان کا بڑا احترام تھا - گابریل[1] خلیفہ ہارون الرشید کا ذاتی طبیب تھا اور نسطوری عیسائی - ذاتی جائداد سے اس کی آمدنی ۸ لاکھ درہم سالانہ تھی اور دو لاکھ ۸۰ ہزار درہم اس کو خلیفہ کے دربار سے تنخواہ ملتی تھی - ہارون الرشید ہی کا ایک دوسرا عیسائی طبیب تھا اس کی تنخواہ ۲۲ ہزار درہم سالانہ تھی - ساہوکاری، بڑے تجارتی کاروبار کپڑے کی تجارت، زمینداری، طب کا پیشہ وغیرہ ان میں عیسائی اور یہودی بہت تھے اور بڑے استحکام کے ساتھ جمے ہوئے۔

عباسیوں کی حکومت کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ سرکاری ملازمت میں غیر مسلموں کا بڑا غلبہ تھا - ان کی تعداد اس قدر وحشت ناک درجے تک پہنچ گئی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی مملکت میں مسلمانوں پر ذمی حکومت کر رہے ہیں -

زیادہ تر زرعی زمینیں غیر مسلموں کے قبضے میں رہیں اور ان سے ان پر مناسب خراج لیا جاتا تھا، اگر مسلمان زمینداری حاصل کر لیتے تھے تو بھی خراج وہ ادا کرتے تھے - زمین کے محصولات کے معاملے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا - حسب سابق غیر مسلموں سے وہ برائے نام ٹیکس بھی لیا جاتا تھا جسے جزیہ کہتے ہیں اور جس کے ذریعے

---

[1] Gabriel.

ان کو فوجی خدمت سے استثنےٰ حاصل ہو جاتا تھا۔ مسلمان فوجی خدمت سے کسی طرح مستثنےٰ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کو اس کے ساتھ ساتھ زکواۃ بھی ادا کرنی پڑتی تھی جو جزیے کے مقابلے میں بڑا بھاری ٹیکس تھا۔

مگر بعض اوقات ان عیسائیوں کو جو مسلمانوں کے تحت حکومت تھے بیرونی مسیحی طاقتوں کی اس روش سے مصائب میں مبتلا ہونا پڑا کہ وہ مسلمان فرماؤں کے ساتھ اپنے تعلقات میں بدنیتی برتتی تھیں نائی سی فورس[1] شہنشاہ بازنطین کی مثال اس موقع پر قابل بیان ہے۔ اس نے ہارون الرشید کے ساتھ متواتر بدعہدیاں کیں اس لئے خلیفہ کو عیسائی کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ مسلم ممالک میں جب کبھی عیسائیوں پر سختیاں ہوئیں اس کا باعث یہی ہوا کہ بیرونی مسیحی طاقتوں یا دوسرے دشمنان اسلام کے اشتعال سے انہوں نے ایسی حرکتیں کیں جن سے ان کی وفاداری مشتبہ ہو گئی۔

اس سب کے باوجود عباسی حکومت میں عیسائیوں کے ساتھ بڑی رواداری برتی گئی۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ خلیفہ کی موجودگی میں متعدد مذہبی مناظرے ہوئے۔ نسطوری عیسائیوں کے پادری طموتھی[2] نے خلیفہ مہدی کے حضور میں مسیحیت کی طرف سے ۷۸۱ء میں جو معذرت نامہ پیش کیا تھا وہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ ال کندی کا وہ رسالہ ہے جس میں مسیحیت اور اسلام کی خوبیوں کے موازنے کی وہ بحث نقل کی گئی ہے جو ۸۱۹ء میں مامون کے سامنے ہوئی تھی۔

---

[1] Nicephorus

[2] Timothy.

خلیفہ مامون نے ایک باضابطہ مجلس دولت (کونسل آف اسٹیٹ) قائم کی تھی جس میں سلطنت کے تمام فرقوں کی نیابت تھی۔ اس طرح اس میں مسلمان، یہودی، عیسائی، صابی اور زرد اشتری سب تھے۔ عقیدے اور عبادت کی آزادی مسلمانوں کی حکومت میں ہمیشہ غیر مسلموں کو حاصل رہی۔ اگر کبھی اس پالیسی میں فرق آیا تو کسی مقامی گورنر کے ذاتی مزاج کی وجہ سے ایسا ہوا۔

مامون کے زمانے میں غیر مسلموں کو جو آزادی حاصل رہی وہ بڑی فیاضانہ اور مثالی تھی۔ سنا ہے کہ اس کی حکومت میں گیارہ ہزار گرجے اور سینکڑوں سیناگوگ اور مندر تھے۔ بیت المقدس اور انطاکیہ کے پادری عیسائی گرجوں کے سربراہ اعلیٰ تھے۔ پیٹری آرک[1] کے بعد جسا لک[2] اور اس کے بعد میٹرن[3] پھر اسقف[4] اور سب سے نیچے قسیس[5] ان سب کو وہ تمام امتیازات اور آزادیاں حاصل رہیں جو خود ان کے ہم مذہب بادشاہوں کے زمانے میں تھیں۔

مامون خود تبلیغ اسلام کی کوششوں میں بڑا پرجوش تھا۔ اس نے سلطنت کے ایسے بعید ترین علاقوں میں کافروں اور مشرکوں کو دعوتِ اسلام بھیجی جیسے ماوراء النہر اور فرغانہ مگر اس کے ساتھ ہی اپنا مذہب قبول کرنے کے لئے جبر کر کے اس نے اپنے شاہانہ اختیار کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ جب مانوی فرقے کا پیشوا یزدان بخت بغداد آیا اور اس نے

---

[1] Patriarch [2] Jasalick

[3] Matran [4] Usraf

[5]

مسلمان علماء سے مناظرہ کیا اور اس میں اس کو بالکل سکوت اختیار کرنا پڑا تو خلیفہ نے اس کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی۔ لیکن یزداں بخت نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ "امیرالمومنین آپ کی نصیحت سنی اور آپ کی باتیں سماعت کیں لیکن آپ ان میں سے ایک ہیں جو لوگوں پر اس کے لئے جبر نہیں کرتے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کریں۔" خلیفہ اس ناکامی پر خفا نہیں ہوا بلکہ اس کی حفاظت کے لئے سپاہی مقرر کر دیے تاکہ ناسمجھ لوگ اس کی توہین و تذلیل نہ کریں۔

علی طبری کی کتاب الدین والدولۃ جو متوکل کی مدد سے دربار میں لکھی گئی اور نیم سرکاری طور پر اسلام کے محاسن کے اظہار اور اس کی حمایت پر مشتمل ہے اس کا لہجہ نہایت معتدل ہے اور اس میں کسی قسم کا جوش اور جذب نہیں ہے، بڑی کثرت سے انجیل کے حوالے ہیں جو بظاہر اس کے سُریانی متن کے ابتدائی عربی ترجمے سے لئے گئے ہیں۔ جس وقت الندیم نے الفہرست لکھی (۹۸۸ء) تو توریت اور انجیل دونوں کے ایک سے زیادہ متن عربی زبان میں موجود تھے۔ ان میں جو روایات کے اختلافات تھے ان سے مسلمانوں کو دلچسپی پیدا ہوئی اور بہت سے دوسروں کے علاوہ الجاحظ نے عیسائیوں کے جواب لکھے۔

عباسی خلفاء کی مسیحی رعایا میں زیادہ تر شامی کلیسا کے دو فرقے تھے جو بڑے راسخ العقیدہ سمجھے جاتے تھے۔ ایک یعقوبی اور دوسرا نسطوری۔ نسطوریوں کو بغداد میں سکونت رکھنے کا حق تھا اس امتیاز کے لئے یعقوبیوں نے ہمیشہ کوشش کی مگر وہ ان کو حاصل نہیں ہوا۔ جہاں پادری کا مرکز تھا اس کے گرد ایبرۃ الروم قائم ہوگیا تھا۔ اسی سے بغداد میں عیسائیوں

کا ایک محلہ پیدا ہوا جسے دارالروم کہتے تھے۔ کیتھولکوں کے دائرۂ اثر میں سات بستیاں آباد تھیں جن میں بصرہ، موصل اور نصیبین بھی شامل تھیں۔ ہر ایک کے ماتحت دو یا تین اسقف تھے جو شخص بڑی آرک منتخب ہوتا تھا اس کا تقرر خلیفہ کرتا تھا اور یہ اس وجہ سے کہ یہ خلیفہ ہی کا منصب تھا کہ اس کو سلطنت کے عیسائیوں کا پیشوا تسلیم کرے۔ یعقوبی (جیکو بائیٹس) جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ خلیفہ کے حریف بازنطینیوں کے ہمدرد ہیں بغداد میں ان کا دیر بھی تھا۔ مگر دارالخلافت سے دور۔ مجموعی طور پر شرقی بغداد میں یعقوبیوں کی چھ دیریں تھیں اور مغربی بغداد میں اس کے علاوہ ۔

یہودی

زیر حفاظت قوموں میں یہودی بھی تھے اور ان کی حالت عیسائیوں سے بھی اچھی تھی۔ ۳۸۵ھ میں اقدسی نے یہ دیکھا کہ شام میں اکثر صراف اور ساہوکار یہودی تھے اور محرر اور طبیب عیسائی۔ کئی خلفاء کے ماتحت اور خصوصاً معتضد (۹۰۲ - ۸۹۲) کی حکومت میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک سے زیادہ یہودی حکومت کے بڑے عہدوں پر مامور تھے۔ خاص بغداد میں یہودیوں کی خاص بڑی آبادی تھی۔ ٹیوڈیلا کے بنجمین نے ۱۱۶۹ء میں اس آبادی (کالونی) کا معائنہ کیا اور یہ دیکھا کہ اس میں ربیوں کے دس مدرسے تھے اور بیس سائی نوگاگ[۱] (عبادتگاہیں) بابل کے یہودیوں کے سردار کے اعزاز کا جو حضرت داؤد کی اولاد میں تھا اس نے بڑے رنگین

Synagogues. [۲] Benjamin.

الفاظ میں ذکر کیا ہے اور واقعی دربار خلافت بغداد کے ساتھ یہودیوں کی وفاداری اسی کی رہنمائی میں تھی۔ جس طرح کیتھولک کو سلطنت کے تمام عیسائیوں پر کسی حد تک اختیار حاصل تھا ایسا ہی اس کو اپنے تمام ہم مذہبوں پر۔ یہ شہزادہ جس کا خاندان بخت نصر کے زمانے میں فلسطین سے گرفتار ہو کر بابل آیا تھا بڑی شاہانہ شان سے رہتا تھا۔ اس کے مکانات اور باغات تھے اور بڑا رقبہ زیر کاشت تھا۔ جب وہ خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوتا تو کامدار ریشمی لباس پہنتا، سر پر سفید عمامہ ہوتا اور اس میں جواہرات جگمگ کرتے، جلو میں سوار چلتے، ایک نقیب آگے ہوتا جو یہ پکارتا جاتا ــ ہمارے آقا ابن داؤد کے لئے راستہ چھوڑ دو۔

مگر جنگہائے صلیبی کے زمانے میں دنیائے اسلام و مسیحیت کے درمیان تعلقات اس قدر خراب ہوئے اور جذبات میں ایسی تلخی پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی حقیقی فیاضی، رواداری اور کشادہ دلی کا اچھی طرح مظاہرہ ہوگیا مسلمانوں نے اس مصیبت کے زمانے میں بھی جب دوسری قوموں نے بد سے بدتر کیا اپنے اصول نہیں چھوڑے۔

صلاح الدین کی انسانیت اور انطاکیہ کے فرمانروا کا ظلم جس سے عیسائی بھی نہ بچے قابل دید موازنہ تھا۔ ملز[1] کہتا ہے کہ بہت سے عیسائی بیت المقدس میں سے نکل کر انطاکیہ چلے گئے۔ صرف یہی نہیں کہ بوہمنڈ[2] نے ان کو اپنے ملک میں ٹھیرنے نہیں دیا بلکہ ان کو لوٹ بھی لیا۔ وہ پھر مسلمانوں میں آئے اور مسلمانوں نے ان عیسائیوں کا خیر مقدم کیا۔

بیت المقدس سے جو عیسائی نکل کر گئے ان پر ان کے ہم مذہبوں نے

---

[1] Mills.   [2] Bohmond.

نے جو مظالم کیے ان کی بعض حیرت انگیز تفصیلات مائی سنند نے بیان کی ہیں۔ وہ شام میں آوارہ پھرتے رہے اور کچھ غم سے مر گئے اور کچھ بھوک سے۔ طرابلس نے ان کے لئے اپنے دروازے بند کر دیئے، مایوس ہو کر ایک عورت نے اپنا شیر خوار بچہ سمندر میں پھینک دیا اور ان عیسائیوں کو کوستی رہی جنہوں نے پناہ دینے سے انکار کیا۔" شکست خوردہ عیسائیوں کے جذبات کا صلاح الدین نے اس قدر پاس کیا کہ وہ اس وقت تک بیت المقدس میں داخل نہیں ہوا جب تک کہ وہ سب نکل نہ گئے وہ صلیبی جنگ کر رہے تھے۔ جنگ سے جو تباہیاں ہوئیں ان کی مرمت اور درستی کی گئی، عیسائیوں نے جو مسجدیں اور اور دارالعلوم منہدم کر دیئے تھے وہ از سر نو تعمیر کیے گئے جو مسجدیں اور مدرسے انہدام سے بچ گئے تھے مگر ویران تھے ان میں نماز اور تعلیم جاری ہوئی اور اہل صلیب کے پُر وحشت اور ظالمانہ طرز حکومت کی جگہ شائستہ اور دانشمندانہ انتظام قائم ہوا۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ صلاح الدین کی شجاعانہ زندگی اور مزاج نے اس دور کے عیسائیوں کے دل مسخر کر لیے تھے۔ بعض نائٹوں کو اس سے اس قدر گہرا تعلق پیدا ہوا کہ وہ عیسائی مذہب ترک کر کے مسلمان ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایک برطانوی ٹیمپلر[1] کی قابل ذکر مثال ہے۔ رابرٹ[2] آف سینٹ ایلبن مشہور تھا۔ ۱۱۸۵ء میں یہ مسلمان ہوا اور صلاح الدین کی پر پوتی سے اس کی شادی ہوئی۔ دو سال بعد صلاح الدین نے فلسطین پر فوج کشی کی اور جنگ ہٹن[3] میں اس نے عیسائی فوج کو شکست فاش دی۔ بیت المقدس کا بادشاہ

---

[1] Templer. [2] Robert of St Allans.

[3] Hittan..

گوئے[1] گرفتار ہوا۔ جنگ شروع ہونے سے ایک دن قبل اس بادشاہ کے دس نائٹ جن کے متعلق یہ اعتقاد تھا کہ ان کے قبضے میں شیاطین ہیں اس کو چھوڑ کر صلاح الدین کے مستقر میں آئے اور مسلمان ہو گئے۔

یقیناً مقامی عیسائی، حامیان صلیبی جنگ کے مقابلے میں مسلمانوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے اور جب بیت المقدس پر مسلمانوں کا قطعی اور کامل قبضہ ہو گیا (۱۲۴۴ء) تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین کی عیسائی آبادی نے مسلمانوں کا خیر مقدم کیا۔

مسلمانوں کی حکومت میں مذہبی آزادی کے اسی اطمینان کی وجہ سے ایشیائے کوچک کے عیسائیوں نے سلجوقیوں سرداروں کی حکومت کا خیر مقدم کیا اور ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھا، جنہوں نے بازنطینیوں کی حکومت سے ان کو رہائی دی۔ مسیحی بازنطینی حکومت سے ان کو صرف اسی وجہ سے نفرت نہیں تھی کہ اس کا نظام محصولات سخت ظالمانہ تھا بلکہ یونانی کلیسا دوسرے فرقوں کے عیسائیوں پر سخت مظالم کرتا تھا۔ ان مظلوم فرقوں میں پالیشین[2] اور آئی کوناک لاسٹس[3] قابل ذکر ہیں۔ مائیکل ہشتم کے زمانے میں اندرون ایشیائے کوچک کے چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندے اکثر ترکوں کو دعوت دیتے تھے کہ وہ ان کے شہروں پر قبضہ کریں تاکہ وہ بازنطینی سلطنت کے مظالم سے نجات پائیں اور امیر اور غریب سب ہجرت کر کے ترکی مقبوضات میں آباد ہوتے تھے۔

---

[1] Guy. [2] Paulicians [3] Iconoclasts.

مسلم تہذیبات

ان کی بنیادیں اور ان کی نشوونما

از

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی

ڈین فیکلٹی آف آرٹس یونیورسٹی آف کراچی

مترجمہ: سید حسن ریاض

پہلا ایڈیشن

نشریات جمعیت الفلاح کراچی

ناشر: ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سکریٹری جمعیت الفلاح کراچی